حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

ISSN-2278-6902

جون 2017ء

-/30روپے

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

جناب اے کے خان مشیر برائے اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ' محکمہ اقلیتی بہبود تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے اشتراک سے عثمانیہ یونیورسٹی صدی تقاریب کے ضمن میں منعقدہ دوروزہ سمینار کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے۔ شہ نشین پر عالی جناب نجف علی خان نبیرہ نواب میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ سابع' جناب سید عمر جلیل سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود' پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر/ سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی' پروفیسر بیگ احساس سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی' جناب محمد معید جاوید صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی' پروفیسر احمد اللہ خان سابق پرنسپال لاکالج عثمانیہ یونیورسٹی اور دیکھے جاسکتے ہیں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں منعقدہ تخلیقی ادب پینل کی میٹنگ میں جناب رتن سنگھ، پروفیسر ارتضیٰ کریم (ڈائریکٹر کونسل)، جناب سید محمد اشرف (صدر اجلاس)، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر انور ظہیر انصاری، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر شمس اقبال (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر) محترمہ شائستہ یوسف، محترمہ ترنم ریاض، جناب محسن خاں، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر)، محترمہ آگینہ عارف (ٹیکنیکل اسسٹنٹ)

بیادگار سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۹۷ شمارہ: ۶ ماہ: جون سال: ۲۰۱۷ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِسالانہ قیمت: -/30

❁ ہندوستان: **300روپے** ❁ کتب خانوں سے: **400روپے**

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے ❁ مغربی و عرب ممالک سے 60ڈالر یا 40پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 Editor: 9849256723 Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

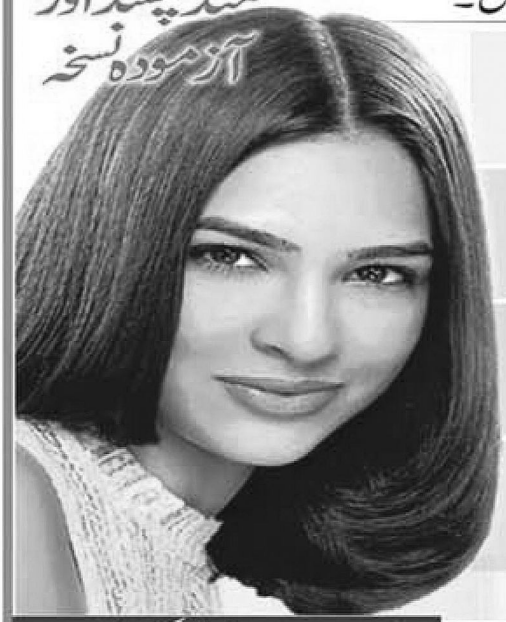

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسودراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

اقلیت نواز حکومت	بیگ احساس	06

انٹرویو

ایک دیرینہ خواب کی تعبیر: مشتاق احمد یوسفی سے ملاقات	رحمان فارس	08

مضامین

مجتبیٰ حسین اور رینٹ ہوٹل میں	اسیم کاویانی	12
ایک ماڈرن صوفی کی کہانی	علی احمد فاطمی	19
اُردو شاعری کا آٹھواں در: نسیم سیّد	خورشید حیات	26
زبیر رضوی بحیثیت مدیر	یٰسین احمد	31
تخلیقی زمین کی نئی کیاری	شائستہ فاخری	35
''بیگ احساس کی افسانہ نگاری: دخمہ کی روشنی میں''	زبیر عالم	40
راجندر سنگھ بیدی بحیثیت ڈراما نگار	نوشین عثمانی	44

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیرا/اشرف رفیع	48

طنز و مزاح

سوختنی نہ فروختنی	خامہ بگوش	53

افسانے

ایک اجنبی	محمد مظہر الزماں خان	57
نیا کلینڈر	مجیر احمد آزاد	59
شیخن بی	محبوب پاشاہ اعظمی	63

شاعری

حامدی کاشمیری، علیم صبا نویدی، جنوں اشرفی، پی پی سریواستو رند رخشاں ہاشمی	معین الدین شاہین، آفاق فاخری، شارق عدیل	66

مطالعہ

غضنفر کی مثنوی: مثنوی کربِ جان	سید یحییٰ نشیط	73

رپورتاژ

دو روزہ قومی سمینار عثمانیہ یونیورسٹی.... تاریخ تہذیب اور امکانات	رؤف خیر	78

اداریہ

اقلیت نواز حکومت.....!

رمضان المبارک کے آغاز کے ساتھ ہی شہر حیدرآباد کی رونق میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ دکانوں اور ہوٹلوں کو خوب سجایا جاتا ہے۔ حیدرابادا پنے کھانوں کی وجہ سے بے حد مقبول ہے۔ بہت کم شہر ہمہ واقسام کی غذاؤں میں حیدرآباد کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حیدرآبادی کھانے کے بھی بہت شوقین ہوتے ہیں پھلوں کے ٹھیلے، بیسن سے بنائی ہوئی تلی ہوئی اشیاء، کباب، دہی بڑے اور دیگر غذاؤں سے بھری عارضی دکانوں پر بھی بے پناہ بھیڑ ہوتی ہے۔ کیا امیر اور کیا غریب سبھی سیر ہوکر کھاتے ہیں۔ حلیم حیدرآباد کی خاص ڈش ہے جس کے ذائقے کے حیدرآبادی بلا لحاظ مہذب وملت دیوانے ہیں۔ غیر مسلم بھائیوں و بہنوں کو بھی طرح طرح کی ذائقہ دار غذاؤں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یکجہتی کا مثالی مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ بڑی بڑی کپڑوں کی دکانوں سے لے کر فٹ پاتھ پر کپڑے بیچنے والوں تک کا خوب کاروبار ہوتا ہے۔ یکجہتی کا یہ مظاہرہ افطار پارٹیوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مذہبی اعتبار سے ان افطار پارٹیوں کی جو بھی اہمیت ہو تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے۔ ریاست حیدرآباد میں موجودہ حکومت نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب کی عیدوں وتہواروں کے موقع پر فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ماضی میں جس کی مثال نہیں ملتی۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ 24 اسمبلی حلقوں کے تحت 420 مساجد میں افطار کا اہتمام کیا جائے گا۔ اور ہر مسجد میں 500 گفٹ پیاکس کی تقسیم عمل میں آئے گی۔ ہر کارپوریٹر کے علاقہ ومساجد اور ہر رکن اسمبلی کے حلقہ میں چار مساجد کا انتخاب کیا جائے گا۔ حیدرآباد کے حدود میں واقع شیعہ، ومہدوی فرقوں کی مساجد اور یتیم خانوں میں بھی افطار اور کپڑوں کی تقسیم عمل میں آئے گی۔ گزشتہ سال حکومت نے دو لاکھ افراد کو کپڑے تقسیم کیے گئے تھے جاریہ سال یہ تعداد چار لاکھ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اضلاع کے 95 اسمبلی حلقوں میں 380 مساجد کا انتخاب کیا جائے گا۔ حیدرآباد کے علاوہ اضلاع کی مساجد میں بھی افطار کا اہتمام کیا جائے گا۔ ہر شخص پر 200 روپے کے حساب سے فنڈس متعلقہ ضلع کلکٹر کو جاری کیے جائیں گے اس کے علاوہ ہر مسجد کو 500 کپڑوں کے گفٹ پیاکس کی اجرائی محکمہ اقلیتی بہبود کی جانب سے عمل میں آئے گی۔ سلم علاقوں اور غریب بستیوں سے قریب واقع مساجد کا انتخاب عمل میں آئے گا۔ مساجد کمیٹیوں کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ بے سہارا و بیوہ خواتین اور یتیم ویسیر بچوں کی نشان ہی کریں۔ ڈائریکٹر اقلیتی بہبود کی جانب سے گفٹ پیاک کے معیار کا

جائزہ لینے کے لیے فلائنگ اسکواڈ تشکیل دیا جارہا ہے۔ مکہ مسجد کے لیے بھی فنڈز جاری کیے گئے۔ وضو کا پانی صاف رکھنے کے لیے واٹر پیورفائر نصب کیے گئے ہیں۔ مسجد میں 43 نئے سی سی ٹی کیمروں کی تنصیب عمل میں آئی۔ مکہ مسجد حوض میں نئے فوارے جاری کیے گئے۔ مکہ مسجد کی تزئین نو، تعمیر و مرمت کے لیے چیف منسٹر نے 8 کروڑ 48 لاکھ روپے رقم مختص کی ہے۔

تلنگانہ حکومت نے اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے 201 اقامتی اسکولوں کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ جن میں 70 اقامتی اسکول گزشتہ سال قائم کیے گے تھے جملہ 131 اسکولوں میں جاریہ تعلیمی سال آغاز ہوگا۔ حکومت نے کارپوریٹ طرز کی معیاری تعلیم فراہم کرنے کے لیے اسکولوں کے قیام کا اعلان کیا ہے۔

اقلیتوں کے لیے حکومت کے یہ کام قابل ستائش ہیں۔ چیف منسٹر نے عثمانیہ یونیورسٹی صدی تقاریب کے لیے بھی 200 کروڑ روپے جاری کیے۔ جس کی افتتاحی تقریب میں محترم پرنب مکرجی، صدر جمہوریہ ہند نے شرکت فرمائی۔ محکمہ اقلیتی بہبود اور تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی نے دوروزہ سمینار منعقد کیا جس کی رپورٹ شامل کی جارہی ہے۔ غزل گلوکار پنکج ادہاس کا پروگرام بھی ان تقاریب کے سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ غزل کا یہ پروگرام بے حد کامیاب ہوا۔ پورے کلاتھورنم میں تل دھرنے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ آڈیٹوریم اور باغِ عامہ کے گیٹ کے باہر سڑکوں پر ٹھہر کر لوگوں نے پروگرام سنا۔ اس کے لیے ہم محکمہ اقلیتی بہبود اور اردو اکیڈیمی کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی صدی تقاریب کے سلسلے میں ایک بات کی توجہ دہانی ضروری ہے۔ آرٹس کالج کی عمارت جو دنیا کی بہترین عمارتوں میں سے ایک ہے اس کی چھت ٹپکنے لگی ہے۔ برسوں قبل اس کی معمولی داغ دوزی ہوئی تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس شاندار عمارت کی تزئین نو کی جائے۔ دیواروں کی دراڑوں سے بھی پیپل کے درخت سر ابھار رہے ہیں جو خطرے کی علامت ہیں۔ اس عمارت کی مناسب دیکھ بھال کی جائے تو مزید سو برس اسی شان و شوکت کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے۔ سٹی کالج کی جانب توجہ کی گئی ہے جو ایک قابل ستائش اقدام ہے۔ لیکن آرٹس کالج ہمارے ملک کی ایک شاندار عمارت ہے جس کے چرچے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ عمارت ہندوستانی تہذیب کی بھی علامت ہے اور مختلف فنِ تعمیر کے دبستانوں کی مظہر بھی ہے۔

25 رمئی 2017ء کو ساڑھے پانچ بجے مشہور فن کار، ڈراما آرٹسٹ، شاعر اور حیدرآبادی تہذیب کی نمائندگی کرنے والی شخصیت محمد حمایت اللہ کا انتقال ہوگیا۔ تین برس سے وہ علیل تھے۔ روزنامہ ''سیاست'' کے زیر اہتمام ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گی تھی اور انھیں کتاب ''نذرِ حمایت اللہ'' پیش کی گئی تھی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ڈاکٹر ضیاالدین احمد شکیب ان دنوں لندن میں سخت بیمار ہیں۔ ادارہ ان کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہے۔ اس شمارے میں دو بڑے مزاح نگاروں سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ اپنی رائے سے نوازیں۔

بیگ احساس

انٹرویو

ایک دیرینہ خواب کی تعبیر: مشتاق احمد یوسفی سے ملاقات

ادھر کچھ ماہ قبل ایک شوخ چنچل لڑکی ہمیں ملی۔ آدھ پون گھنٹے کی گفتگو کے بعد کہنے لگی کہ ''یوسفی صاحب بات چیت میں تو آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں مگر تحریر میں بالکل لچّے لگتے ہیں'' (مشتاق یوسفی)

صاحبو! یہ جملہ ان درجنوں قہقہوں اور غیر مطبوعہ جملوں میں سے ایک ہے جو ہم نے یوسفی صاحب سے ملاقات کے دوران انہی کی زبانی سنے اور آپ کو سنانے والے ہیں جب برسوں پرانے کسی خواب کی تعبیر مل جائے تو انسان خوشی سے گنگ حیرت سے گم اور بے یقینی سے ہکّا بکّا رہ جاتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی سے مل کر ہم پر یہ تینوں شدتیں ایک سات نازل ہوئیں۔ یہ کہنے میں کیا تکلف اور تامل کریں کہ یوسفی نے ہمارے بچپن کی گھنگھورا داسیوں کو سہلایا نوجوانی کے گھٹا ٹوپ شب و روز کو گرمایا اور گنجلک روزگار کو آسان بنایا ہے۔ ہم ان سے ملے بغیر ان کے ان گنت احسانوں تلے دبے تھے۔ سو جب ملے تو ہمارا سا کت و ششدر رہ جانا ہی بنتا تھا۔

معروف و بے مثال شاعرہ ڈاکٹر عنبریں حسیب عنبر کا یہ احسان شاید ہم ساری زندگی نہ چکا پائیں کہ انھوں نے ہمیں یوسفی سے ملوایا حسیب بھائی یعنی عنبر کے شوہر نامدار بھی ہمراہ تھے۔ ہم گھر ڈھونڈ ڈھانڈ کر پہنچے تو دروازے پر ایک عدد جیّد کتّے کو چشم براہ پایا۔ دیدہ و دل ہی نہیں بلکہ دندان و دُم بھی فرش راہ کیے بیٹھا تھا۔ یوسفی کا مرحوم کتّا (اللہ بخشے) سیزر یاد آ گیا۔ موجودہ سگ سیزر کا سگّا پڑ پوتا ہے۔ شاید اس کا نام البتہ یوسفی نے ''زار'' رکھ چھوڑا ہے واضح رہے کہ یہ زار و قطار رونے آہ و زاریاں کرنے یا ''پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں'' والا زار نہیں۔ روسی شہنشاہوں والا زار ہے۔ نام تو تھا ہی شہنشاہوں والا، عادات بھی ہو بہو ویسی ہی تھیں۔ دم سادھے فرش پر یوں پڑا تھا جیسے تخت پر نشینی بادشاہ ''جو نا خلف دکھائیں سونا چار دیکھنا''

کتّے نے (کہ جس کو کتا کہنا بدتہذیبی ہوگی) انگڑائی تو عنبر سہم کر کہنے لگیں کہ ''ارے ارے دیکھیے! ہمیں کاٹنے کی تیاری کر رہے ہیں یہ'' خانساماں نے آ کر ترنت اس ناہنجار کو طوق در گلو کیا تو ہماری گلوخلاصی ہوئی اور ہم اندر گھسے۔

یوسفی کے گھر کے ڈرائنگ روم سے جمالیات کا ہر پہلو ہویدا تھا۔ روشنی، رنگ، خوشبو، موسیقی، مجسمے اور محبت! ہر شئے ترتیب سے رکھی ہوی۔ یوسفی داخل ہوئے تو ہم سمیت سب اسباب جمالیات نے تعظیم سے استقبال کیا۔ شلوار قمیص میں لپٹا چھیانوے سالہ انتہائی لاغر و نحیف جسم، ستا ہوا مگر ہنستا مسکراتا مطمئن چہرہ، آواز ایسی موہوم، ملائم اور مدھم کہ کان لگائے بغیر سننا مشکل (ہم تو خیر ان کے حرف حرف کے لیے ہمہ تن گوش تھے) اٹھک بیٹھک اور چلت پھرت میں نقاہت مانع تھی مگر جب بولنے لگے تو چست و چاق و چوبند، چٹکلے تھے کہ رنگ برنگ پھلجھڑیوں کے مانند ان کے لبوں سے پھوٹ رہے تھے۔ باتیں ایسی کہ مارے خوشی کے دل دو پھانک ہو جائے۔ آتے ہی وہ صوفے پر بیٹھ گئے تو ہم بھی ہاتھ باندھے دھڑکتے دل لیے بیٹھ گئے۔ کمرے میں ایک دم گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ ہم نے سوچا شاید لیجنڈ کی موجودگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ کافی دیر تک یوسفی ٹکٹکی باندھ کر فرش کو اور ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے نگاہ اٹھائی اور عنبر سے کہنے لگے ''بھئی آپ کے جوتے بہت خوب صورت ہیں'' عنبر اس غیر

متوقع جملے (حملے) کی تاب نہ لاکر شکریہ ادا کر کے ہنسنے لگیں۔ یوسفی بولے ''آپ ہی کی عمر کی ہوگی وہ لڑکی جو ہم سے ملیں۔ ڈاکر بن رہی تھیں شاید، رخصت ہو تے وقت اٹھلا کر کہنے لگیں کہ ''یوسفی صاحب! ایک بات تو بتایئے۔ آپ جیسے عمر رسیدہ مرد جب مجھ جیسی نوجوان لڑکیوں سے ملتے ہیں تو جاتے جاتے یہ کیوں کہتے ہیں کہ بھئی ! ملتی رہا کرو'' اب قہقہوں کا دور شروع ہوا۔ ہم نے ازراہ تلطف پوچھا کہ ''سرکار! آج کل طبیعت کیسی ہے؟''

کہنے لگے ''میاں! اپنے آپ پر پڑا ہوں۔ زندگی میں تو غم سے چھٹکارا نہیں ملنے کا'' ہم نے عرض کیا کہ ''جی ہاں! غالبؔ نے یہی کہا تھا کہ:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے اور بولے کہ ''نہیں! قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں''

ایک اور قہقہہ لگا۔ ہم نے کریدنے کی خاطر پوچھا کہ ''مرشد آپ کی کتابوں میں سے کونسی آپ کے دل کے بہت نزدیک ہے؟'' آنکھوں میں شرارت بھری چمک لیے بولے کہ ''کتابوں کی تو خیر نہیں البتہ کچھ چہرے ضرور دل کے نزدیک ہیں جن کا نام لینے میں ہمیں تکلف ہے'' جملے کی داد دیجئے صاحبو! ایسے جملے بولنے والے اب ایک ہاتھ کی ایک انگلی پر گنے جا سکتے ہیں۔ یوسفی کے معاملے میں ہم ایک سے آگے کی گنتی کے قائل نہیں کیوں کہ ان کا کوئی ثانی ہے ہی نہیں۔

ہم نے سگ زار کا ذکر چھیڑا کہ ماشاءاللہ سے بہت صحت مند چوکس اور ہوشیار کتّا ہے۔ اللہ نظر بد اور مست ماداؤں سے بچائے۔ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا ''ایک فرانسیسی ادیبہ کا قول ہے کہ ''میں مردوں کو جتنا قریب سے دیکھتی ہوں اتنا ہی مجھے کتّے اچھے لگتے ہیں'' اس سے پہلے کہ ہمارا فلک شگاف قہقہہ ان کی سماعت پر گراں گزرتا بولے ''مرزا کے ایک دوست ہیں جو کتیا کو کتیا نہیں کہتے از راہِ احترام وعقیدت فی میل (Female) کہتے ہیں۔ مرزا کو جب سے اس بات کی خبر ہوئی ہے وہ بھی احتیاطاً اپنی بیگم کو فی میل کہنے لگے ہیں''۔ بلند بانگ قہقہے ذرا تھمے تو یوسفی پینترا بدل کر عنبر سے پوچھنے لگے ''آپ کہاں ہوتی ہیں؟ اور کیا شغل فرماتی ہیں''؟ عنبر نے بتایا کہ ''ہم کراچی ہی میں ہوتے ہیں اور شاعری کرتے ہیں''

نسیاں کے باعث یوسفی بار بار بھول جاتے تھے کہ وہ عنبر سے یہ سوال پہلے پوچھ چکے ہیں۔ لہٰذا اگلے ڈھائی گھنٹے میں بہت معصومیت سے بہتیری بار یہ سوال پوچھا اور ہر بار عنبر نے مسکرا کر وہی جواب دیا اور تو اور ''لیچی'' والے جملے سے بھی ہم بارہا شاد کام ہوئے اور یوسفی کے انداز وادا کچھ ایسے شاداب ہیں کہ ہر بار پہلے سے زیادہ ہنسی آئی ایک بار تو ہم نے جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ مرشد! جس لڑکی نے آپ کو لیچا کہا آپ اس پر برہم نہیں ہوئے؟

معصوم سی شکل بنا کر کہنے لگے ''نہیں میاں! کہتی تو وہ ٹھیک ہی تھی'' پھر کمرے کے اطراف واکناف پر ایک یوسفیانہ نظر ڈال کر بولے کہ ''وہ سامنے راجستھانی آرٹ کے دو نایاب نمونے ہیں۔ راجستھانی راجہ اور رانی کی ایسی انوکھی شبیہیں جو منّے منّے موتیوں سے بنائی گئی ہیں۔ ہماری کتاب ''آبِ گم'' کا ہندی میں ترجمہ ہوا۔ پبلشر موصوف ہم سے ملنے آئے تو کہنے لگے کہ یوسفی صاحب، رقم کی صورت میں نذرانہ تو ہم دے نہیں پائیں گے۔ سو یہ دو نادر پینٹنگز نذر ہیں۔ گر قبول اُفتد وغیرہ۔ سو ہم نے رکھ لیں کہ ''نہیں جو مال میسر، مصوری ہی سہی'' ہم نے قریب سے جا کر مصوری کے وہ شاہ کار دیکھے۔ واقعی شاہ کار تھے واپس آ کر صوفے پر بیٹھے تو یوسفی کہنے لگے کہ ''آئیل پینٹنگ اور ادھیڑ عمر عورت دور ہی سے دیکھنے پر اچھی لگتی ہیں''۔ ہم اس جملے کی ادھیڑ بن میں گم تھے کہ

عنبر نے پوچھ لیا کہ ''یوسفی صاحب! آج کل آپ انٹرویو دیتے ہیں کیا؟''

بولے'' کچھ دن قبل ایک محترمہ انٹرویو لینے آدھمکیں۔ پہلا سوال ہی یہ کیا کہ یوسفی صاحب آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟ ہم نے کہا'' بی بی! ابھی تو آپ ٹھیک سے بیٹھی بھی نہیں اور یہ مطالبہ؟'' ہنس ہنسا چکنے کے بعد ہماری باری تھی کچھ کہنے اور (کھری کھری) سننے کی۔ سو ہم نے پوچھ لیا کہ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟'' کہنے لگے'' میاں انسان اس وقت تک کلچرڈ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنی ہی کمپنی سے محظوظ ہونا نہ سیکھ لے۔ ہے آدمی خود اک محشرِ خیال'' ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ'' مرشد آپ ہی نے لکھا ہے کہ کلچرڈ آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ مارلین منرو کا سراپا ہاتھ ہلائے بغیر بیان کر سکے'' کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اتنے میں عنبر نے پوچھا کہ'' یوسفی صاحب پھلوں میں کیا پسند ہے'' بولے ڈرائی فروٹ خاص کر نکاح کا چھوارا۔ ویسے تو مونگ پھلی بھی پسند ہے مگر مونگ پھلی اور آوارگی میں خرابی یہ ہے کہ آدمی ایک دفعہ شروع کر دے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ختم کیسے کرے'' تھوڑا سا ہنس ہنسا کر بولے'' بھئی آج کل مونگ پھلی پھانکنے کا وقت کس کے پاس ہے۔ اب تو کمپیوٹرائزڈ تیز رفتار دور ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ایک اچھا جملہ تین چار دن تک نہال اور سرشار کیے رکھتا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی لذت آمیز وقہقہہ آور گفتگو کے بعد ہم اور عنبر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اٹھنے کے اشارے کرنے لگے کہ یوسفی زیادہ دیر بیٹھ کر کہیں تھک نہ جائیں سو ہمیں چلنا چاہیے اب.....

یہی بات ان سے کہی تو بولے'' بھئی جانے کا کوئی اور بہانہ تلاش کرو'' عنبر بولیں کہ'' یوسفی صاحب! ہم تو جانے کا نام نہیں لیں گے۔ آپ ہی کی تھکان کا خیال ہے''

جواب میں عنبر سے کہنے لگے'' بھئی آپ کی قمیص بہت خوب صورت ہے (پھر ہلکے سے توقف کے ساتھ) آب ہم قمیص سے دھیرے دھیرے شمال کی جانب جائیں گے (ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) یہ قمیص اتنی خوب صورت ہے کہ ہمارا بھی ایسے کپڑ پہننے کو دل چاہ رہا ہے'' یوسفی اب مکمل چارج ہو چکے تھے۔ عنبر نے پوچھا'' اپنی کمپنی انجوائے کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟''

بولے'' ایسے دوست بنائیے اور ایسی کتابیں پڑھیے کہ جو آپ کو سوچنے کی تحریک دیں'' عنبر بولیں'' اور اگر دوست نہ ہوں تو؟''

''ایسی حالت میں عام طور سے لڑکیاں شادی کر لیتی ہیں'' حسیب بھائی کافی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ ہم نے کہنی سے ٹھوکا دیا کہ کچھ کہیے تو کہنے لگے'' یوسفی صاحب ہم نے اور عنبر نے شادی تک ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا''

یوسفی بولے،'' پرانے زمانے میں بھی دلہا دلہن کو ایک دوسرے کے چہرے آئینے میں دکھانے کی رسم (آرسی مصحف) نکاح کے بعد ہوا کرتی تھی۔ نکاح سے پہلے چہرے دکھانے میں کسی یا دونوں فریقوں کے بدکنے اور نکاح کینسل ہوجانے کا ڈر تھا''

ہم نے ہنستے ہوئے کہا'' حالاں کہ آپ نے خود ہی لکھا یہ کہ

نکاحِ مرد مومن سے بدل جاتی ہے تقدیریں

کہنے لگے'' بھئی ہمارے ہاں کراچی میں مرد مومن کو مرد میسن کہا جاتا ہے قہقہے لگ چکے تو ہم نے پوچھا'' آج کل کیا پڑھ رہے ہیں؟'' ہلکے سے تبسم کے ساتھ فرمایا'' انگریزی ادب زیر مطالعہ ہے کیوں کہ اردو کا فکشن اور بیشتر ناول ایسے ہیں کہ بندہ بیوی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا'' حسیب بھائی دوبارہ گفتگو میں تشریف لائے: یوسفی صاحب! آپ کو کون سا موسم اچھا لگتا ہے؟

فرمایا'' اپنے اندر کا موسم۔ اس جڑ جائیں تو باہر کی گرمی سردی کی کیا

فکر'' پھر عنبر سے کہنے لگے ''اقبال کا مصرعہ ہے کہ ''گوہر تابدار کو اور بھی تابدار کر'' اس میں گوہر کے لفظ کو شوہر سے بدل کر اپنے شوہر کو سنا سکتی ہیں'' ہر ہر جملہ ایسا تھا کہ قربان جایئے۔ ہم نے پوچھا کہ ''آپ نے اپنی تمام تصنیفات میں کھانے پینے کا بہت ذکر کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

کہنے لگے ''لڑکپن اور جوانی میں جب بد معاشی کے تمام ذرائع بزرگوں نے بند کر دیئے تو کھانا پینا ہی بچا''

عنبر نے موقع دیکھ کر کہا ''فارس! بہت باکمال شاعر بھی ہیں ہمیں دیکھ کر کہنے لگے ''میاں کچھ ہو جائے پھر''

ہم ایک دم گر بڑا گئے کہاں یوسفی جیسا نابغہ روزگار کہاں ہماری تک بندیاں عرض کی کہ ''یوسفی صاحب! اب آپ کو بھلا ہم کیا سنائیں''

کہنے لگے ''اچھا تو آپ ہمیں اس قابل نہیں سمجھتے، ہم نے ڈرتے ڈرتے تین شعر پیش کیے پہلے دو پر بھرپور داد دی جو تا عمر ہمارا اثاثہ رہے گی۔ شعر یوں تھے:

خوشبوئے گل نظر پڑے، رقص صبا دکھائی دے
دیکھا تو ہے کسی طرف، دیکھیے کیا دکھائی دے
تب میں کہوں کہ آنکھ نے دید کا حق ادا کیا
جب وہ جمال گم نما دیکھے بنا دکھائی دے

تیسرا شعر پڑھا تو یوسفی نے ایک تاریخی جملہ کہا شعر تھا کہ:

دیکھے ہووں کو بار بار دیکھ کے تھک گیا ہوں میں
اب نہ مجھے کہیں کوئی دیکھا ہوا دکھائی دے

شعر سن کر مسکرائے اور فرمایا

''بھئی مردوں کی بدنیتی کی کیا خوب شاعرانہ تاویل لائے ہیں آپ''

ہم عش عش کر اٹھے حالاں کہ غش کھانے کا مقام تھا۔ ڈھائی گھنٹے کی نشست کے بعد بھی یوسفی کے وہی چہچہے تھے وہی ٹھٹھے تھے اور وہی ولولے۔ ہم نے یوسفی کے ساتھ ڈھیر ساری تصاویر بنائیں اور رخصت چاہی۔ اٹھتے اٹھتے عنبر نے مشہور جملہ داغنے کی کوشش کی ''ہم اردو مزاح کے عہد یوسفی میں زندہ ہیں''

کہنے لگے ''جو کہتا ہے کہ ہم اردو مزاح کے عہد یوسفی میں زندہ ہیں وہ خود کو زلیخا سمجھتا ہے'' ہم قہقہے لگاتے اٹھے اور کمرے سے دالان تک آنے کے لیے مرشد کو اپنے کندھے کا سہارا پیش کیا۔ ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف کھڑی عنبر سے کہنے لگے ''بھئی آپ بھی تو سہارا دیجئے'' پھر عنبر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے ''ہماری عمر میں لاکھوں میں سے ایک ادھ مرد ہیں شرارت اور بدمعاشی بچتی ہے۔ ہم وہی ایک آدھ ہیں''

رخصتی قہقہے سے ان کے گھر کا دالان گونج اٹھا۔ ہم بے اختیار یوسفی صاحب کے گلے لگ گئے۔ پاؤں چھوئے۔ عقیدت آنسو بن کر آنکھوں سے جاری تھے۔ مشتاق احمد یوسفی کروڑوں لوگوں کے دلوں میں بستے ہیں مگر ہم ان کے خاص الخاص عاشق ہیں۔

مولائے سخن ان کو عمر خضر عطا فرمائے کہ ریا کار لکھاریوں، شاعر نما داریوں اور شہرت کے پجاریوں کے دور میں یہ شخص سچا سچا، کھرا اور خالص فن کار ہے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

ooo

سب رس
میں صرف **غیر مطبوعہ** مضامین اور
تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

مضمون

اسیم کاویانی

مجتبیٰ حسین اور ینٹ ہوٹل میں

مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ اُن کی طالب علمی کا زیادہ تر دور ہوسٹلوں میں گزرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اُن کا طالب علمی سے ہٹ کر زیادہ تر دور ہوٹلوں میں گزرا کرتا تھا ،لیکن اس بات پر ہمارا کوئی قاری اپنی ذہنی روا کبر کے فرمائے ہوئے ع: کٹی عمر ہوٹلوں میں...... کی طرف بھی نہ لیے جائے ،البتہ اس ہوٹل گردی پر جارج برنارڈ شا کے فرحیہ پلے "You Never Can Tell" میں آئے اس مقولے کا اطلاق ہوسکتا ہے کہ "The great advantage of a hotel is that it's a refuge from hom life" (مفہوم: ایک ہوٹل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ گھر کی محدود فضا کے متبادل ایک جائے پناہ کی حیثیت رکھتا ہے۔) ان کی ہوٹل گردی کے معاملات میں خاص طور پر حیدرآباد کے اور ینٹ ہوٹل کا ذکر ان کی تحریروں میں جا بجا آیا ہے ۔ بقول ان کے وہاں اُنھوں نے جو سیکھا وہی عملی زندگی میں زیادہ کام آیا۔ انھوں نے اپنے ایک فکاہیہ مضمون میں لکھا ہے کہ ان کا اور ان کے دوستوں کا گھر چاہے جہاں رہا ہو، پر ان لوگوں نے اپنے گھر کا دیوان خانہ ہوٹل اور ینٹ، کو بنا رکھا تھا۔ راقم نے اُن کے لکھے ہوئے متعدد خاکوں کی مدد سے اسی اور ینٹ ہوٹل کے اسٹیج سے مجتبیٰ حسین اور ان کے رفیقانِ عہدِ جوانی کا قصہ اِن صفحات پر اتارا ہے۔ اس کے سارے واقعات اور وارداتوں کے راوی وہی ہیں ،میرا معاملہ تو محض تماشا کرنے اور دکھانے کا رہا ہے۔ بقول اکبر:

محفل ان کی ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

اُنھوں نے لکھا ہے:

''اور ینٹ ہوٹل' نے ایک زمانے میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو شاید کسی بڑی ادبی انجمن نے بھی انجام نہ دیا ہو۔ اس ہوٹل میں چاہے کچھ ملتا ہو یا نہ ملتا ہو، مگر شعرا کو سامعین بڑی آسانی سے مل جایا کرتے تھے۔ ہر شام یہاں ایک اچھی خاصی غیر رسمی ادبی محفل منعقد ہو جایا کرتی تھی۔''

(ص:157 'مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں' جلد دوم)

ایک اور جگہ 56-1955ء کے زمانے کے اور ینٹ ہوٹل کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''حیدرآباد کے ادبی ماحول کا وہ سب سے زرین دور تھا۔ مخدوم محی الدین ، شاہد صدیقی، خورشید احمد جامی اور سلیمان اریب بقید حیات تھے۔ نئے شاعروں اور ادیبوں کی پوری ایک نسل اُبھر رہی تھی، بلکہ اُبھر چکی تھی۔ شاعروں میں عزیز قیسی، وحید اختر، شاذ تمکنت، قاضی سلیم، مغنی تبسم، سکندر توفیق، انور معظم اور راشد آزر اور ادیبوں میں اقبال متین، جیلانی بانو، نقی تنویر، عوض سعید، عاتق شاہ، آمنہ ابوالحسن، وقار لطیف، اکرام جاوید، ابراہیم شفیق وغیرہ نمایاں تھے۔ ان میں سے اکثر کی شامیں اسی اور ینٹ ہوٹل میں گزرتی تھیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی ٹولی الگ جمتی تھی۔ یونی ورسٹی کے چند بے فکرے اور کھلنڈرے نوجوانوں کی بیٹھک الگ جمتی تھی۔ میرا تعلق اسی موخرالذکر ٹولی سے تھا۔''

(ص:146، 'مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں'، جلد دوم)

ایم اے وحید نے اپنے ایک مضمون' خاکہ نگار کا خاکہ' میں مجتبیٰ حسین کے بارے میں لکھا ہے کہ ویسے تو وہ مجتبیٰ حسین کو اِدھر اُدھر قسطوں میں دیکھا کرتے تھے ،البتہ انھیں یک مشت صرف ایک مقام پر بار بار دیکھا، سابق ریاست حیدرآباد کی ایک سابق

ہوٹل میں جہاں وہ اکثر قہقہے بکھیرا کرتے تھے۔اسی ہوٹل اورینٹ کا غائبانہ ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:''وہ ہوٹل کیا تھی، جاگیردارانہ نظام کی مسخ شدہ تصویر تھی۔ مالک سابق جاگیردار مینیجر سابق عہدے دار، باورچی اور دوسرا اسٹاف کسی زمانے میں شاہی لنگر خانوں سے وابستہ تھے،اب ہوٹل کی ملازمت کر رہے تھے۔ گاہکوں کی اکثریت عہدے داروں،سیاست دانوں،شعرا،ادیبوں،شکاریوں اور جواریوں پر مشتمل تھی۔ان میں وہ نوجوان بھی شامل تھے جو اپنے آپ کو جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ یونی ورسٹی کا طالبِ علم بتایا کرتے تھے۔''1

نقی تنویر کے خاکے میں جو کہ مجتبیٰ حسین کے یکے ازیارانِ دیرینہ میں سے تھے، اُنھوں نے لکھا ہے کہ 'حیدرآباد کا اورینٹ ہوٹل وہ جگہ تھی، جہاں ہم لوگ ہر شام کو ملا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا صحیح ادراک ہمیں اسی ہوٹل میں حاصل ہوا... ہوٹل کیا تھا، ایک ایسا گھاٹ تھا، جس پر ادیب ، شاعر، مصور، سیاست دان اور فلسفی سب ایک ساتھ چائے پیتے تھے۔'2

اگرچہ یہاں اُنھوں کچھ تکلف سے کام لیا ہے۔ دراصل مجتبیٰ حسین اور نقی تنویر دونوں وہاں 'فاقہ بشکم' پہنچتے تھے اور ایسے افسانہ نگاروں اور شاعروں کو نشانہ بنایا کرتے تھے جنھیں اپنی تخلیقات سنانے کا خبط رہا کرتا تھا۔ یہ دونوں اپنی سماعت فرمائی کے عوض خوب کھا پی کر اُن کی جیب ہلکی کر دیا کرتے تھے۔ان فنکاروں میں اکرام جاوید اور ابراہیم شفیق تو ایسے تھے کہ جنھیں دنیا کی کوئی طاقت افسانہ سنانے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ان میں سے ایک جیالا تو دو برس تک ان کی ہوٹلنگ کا بل ادا کرتا رہا تھا۔3

1957-58ء کے قریب اورینٹ ہوٹل میں جیوک باکس لگ چکا تھا، جس میں لوگ سکّے ڈالتے تھے اور اُن کی فرمایش پر فلمی گانوں کے ریکارڈ چلا کرتے تھے۔ان دنوں اقبال بانو کی آواز میں قتیل شفائی کا یہ گیت لوگوں میں بڑا مقبول تھا اور بار بار سنا جاتا تھا:

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو باہیں ڈال کے باہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

لیکن اُن دونوں کی افسانہ خوانی کا والیوم اتنا اونچا رہا کرتا تھا کہ لوگوں کی غصیلی نگاہیں ہوٹل کے مالک سے شکایت کیا کرتی تھیں کہ ہم نے تو فلمی گانوں کی فرمایش کی تھی اور تم ہمیں افسانے سنا رہے ہو! مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ اُن افسانوں کی یلغار سے بچنے کے لیے اُنھوں نے خود ایک چوبیس صفحات کا طویل افسانہ لکھا تھا اور اگلی بار جب وہ دونوں اپنے چھے چھے صفحات کے افسانے سنانے آئے تھے تو اُن کے سامنے شرط رکھ دی گئی تھی کہ پہلے اُنھیں مجتبیٰ حسین کا افسانہ سننا ہوگا اور وہ چوبیس صفحات کا افسانہ دیکھ کر ہی اُن کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ وہ افسانہ بعد میں ان کے لیے ہمیشہ ایک ہتھیار کے طور پر کام آتا رہا تھا۔ بقول مجتبیٰ حسین اُنھوں نے وہ افسانہ محض اِس لیے نہیں چھپوایا کہ وہ اپنے بچاؤ کے اتنے بڑے حربے سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ 4

اورینٹ ہوٹل نے جس طرح مجتبیٰ حسین کی افسانہ نگاری کا آغاز دیکھا تھا، انجام کا بھی شاہد رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کی افسانہ نگاری کی ابتدا کی طرح انتہا کے نمونے بھی پردۂ غیب میں مستور ہو گئے۔ ہوا یوں کہ ہر ایک کے منظورِ نظر مجتبیٰ حسین اسی ہوٹل کے در و دیوار کے بیچ پہلے تو حسن عسکری اور پھر اُن کی علمیت کے گرویدہ ہو گئے، پھر عسکری نے ان پر مغربی علم و دانش اور فکر و فلسفے کا در کھول دیا۔ بالخصوص جرمن فلسفی نیتشے کے گہرے مطالعے نے مجتبیٰ حسین کے ذہن پر دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس طاری

کر دیا۔ انھوں نے اپنے ذہنی وجذباتی بحران پر قابو پانے کے لیے علاج بالمثل کو اپنایا اور دنیا کی ناپائیداری کے حقیقی احساسات سے روبرو ہونے کے لیے اندھیری راتوں میں تنہا ہی عیسائیوں کے قبرستان میں جا کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اورینٹ کے ایک معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ 'عیسائیوں کا گرجا یا کوئی عمارت جو مشرق کی سمت تعمیر ہو'، ہمارے مشرقی اقدار کے ترجمان مصنف نے اُس عیسائی قبرستان کی اندھیری راتوں میں موت کے موضوع پر دس افسانے تعمیر/تحریر کیے تھے۔ اگر اُنھوں نے اپنے وہ افسانے محفوظ رکھے ہوتے تو اُن کی اولین اشاعت کا سہرا سلیمان اریب کے جریدے 'صبا' کے سر بندھتا جو اُن کی اشاعت کے بہت متمنی تھے، مگر مجتبیٰ حسین بہت جلد علاج بالضد کی طرف پلٹ گئے اور اُنھوں نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون لکھ کر اُسے تلافیِ مافات کے طور پر 'صبا' ہی کو سونپ دیا جو 1964ء میں شائع ہوا، مگر اُن کی روشنیِ طبع کی افسانوی تخلیقات روشنائیِ طباعت کا منہ نہ دیکھ سکیں۔

ہوٹل اورینٹ میں مجتبیٰ حسین کی ہر دل عزیزی کی تصدیق بروایت سید خالد قادری، مصحف اقبال توصیفی کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو (توصیفی) کہ وہاں شاذ تمکنت کے ہمراہ پابندی سے بیگم اختر کی غزلیں سننے جایا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اورینٹ میں مجتبیٰ حسین کی حیثیت ایک ایسے ساقی کی سی تھی جس کے جامِ ظرافت سے شاد کام ہونے کے لیے ہر مے کش بے قرار رہتا تھا۔ 'اُن کے ہوٹل کے لاؤنج میں آتے ہی وہاں پر پڑی میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ کرسیوں پر سے اٹھ اٹھ کر اُنھیں بلانے لگتے تھے۔ خود مجتبیٰ ایسے موقعوں پر تھوڑی دیر کے لیے اپنی جگہ ٹھہر کر حالات کا جائزہ لیتے، پھر لوگوں کی چیخ وپکار کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی ایسی میز کی طرف بڑھ جاتے، جس پر اُنھیں اُس دن کا شکار نظر آ جاتا تھا۔' 5

دو ایک اشخاص ایسے بھی تھے جو پہلے تو اُن سے کچھ گریزاں رہے لیکن پھر اُن کی محبت کے گرفتاروں میں شامل ہو گئے۔ سید خالد قادری جب پہلی بار شاذ تمکنت کے ساتھ اورینٹ ہوٹل گئے تھے تو اُنھیں ہوٹل کے لاؤنج میں سانولے رنگ کے مجتبیٰ حسین کو اختر حسن ('پیام' اور اردو 'بلٹز' کے اڈیٹر) جیسے سینئر صحافی کے ساتھ بے تکلفی سے چھیڑ چاڑ کرتے دیکھ کرنا گوار سا گزرا تھا، جب کہ اطراف میں کچھ لوگ قہقہے بھی لگا رہے تھے۔ دراصل مجتبیٰ حسین ان دنوں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین کے فرنٹ پر فعال تھے اور مخدوم، راج بہادر گوڑ اور اختر حسن، جیسے 'سیاسی طور پر بے پناہ' مصروف سینئر بھی اپنی سرگرمیوں کی سرد بازاری کے اس دور میں وقت نکال کر اورینٹ کی محفلوں کو گرمانے کے لیے آ جایا کرتے تھے۔ بہرحال ایک صبح مجتبیٰ حسین نے اُن سے اپنی پہلی ہی ملاقات میں اُن کی چندگم نام تحریروں کی بے شمار تعریفیں کر کے اُن کا قلب منقلب کر دیا۔ وہ اس طرح کہ صبح کو وہ سید خالد کے مدّاح کی طرح اُن سے ملے اور شام کو سید خالد خود اُن کے انتہائی مدّاح بن کر اُن سے رُخصت ہوئے۔ اسے کہتے ہیں: کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے!

وحید اختر کے دل میں تو مجتبیٰ حسین کے لیے جامعہ عثمانیہ کے دنوں سے گرہ پڑی ہوئی تھی، جہاں اُن کے تین سال سینیئر ہونے کے باوجود آرٹس کالج کی بزم اردو کے الیکشن میں نوآمدہ مجتبیٰ حسین نے بازی مار لی تھی۔ بقول مجتبیٰ حسین وحید اختر سے اُن کی باقاعدہ ملاقات تو حیدرآباد کے مشہور ویکاجی ہوٹل میں ہوئی تھی، پھر اورینٹ میں بھی سامنا ہوتا رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ہوٹل میں گونجنے والے قہقہے ایک زمانے تک وحید اختر کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ مجتبیٰ حسین جس میز پر ہوتے، وہیں سے زیادہ قہقہے گونجا کرتے تھے اور انھیں ان قہقہوں سے کدسی ہو

گئی تھی۔6؎

وحیداختر کے علی گڑھ میں بس جانے کے بعد بھی جب کبھی اُن کا حیدرآباد آنا ہوا تھا، اُنھیں عموماً ہر محفل، ہر ریستوراں میں مجتبیٰ حسین کے قہقہوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ حتّا کہ 1972ء کے قریب جب وحیداختر دہلی گئے تو مجتبیٰ حسین بھی حیدرآباد کے محکمۂ اطلاعات کی ملازمت چھوڑ کر دہلی آ چکے تھے اور اُنھوں نے محض چند مہینوں میں وہاں کے نئے ماحول کی اجنبیت کو زیر کرلیا تھا۔ اُن کے اورینٹ ہوٹل کی میزوں سے اُبھرنے والے قہقہے اب دہلی کے پریس کلب اور کافی ہاؤس میں گونج رہے تھے۔ اُنھوں نے کشادہ دلی سے لکھا ہے کہ اُنھیں اُن کے کالج کی بزم اردو کے الیکشن میں شکست دینے والے مجتبیٰ حسین نے یہاں دہلی تسخیر کرلی تھی۔ جب مجتبیٰ حسین دہلی چھوڑ کر حیدرآباد لوٹ گئے، اُس کے بعد جب بھی وحیداختر کا دہلی میں جانا ہوا، وہ اُنھیں بے رنگ سی لگی۔ بقول شجاع خاور ع دلّی آ کر بھی یہ لگتا ہے کہ دلّی دور ہے!

اورینٹ کے دور ہی کے مجتبیٰ حسین کے ایک قریبی ساتھی وقار لطیف بھی تھے، جو علی باقر کے توسط سے ان کے دوست ہی نہیں بنے تھے بلکہ ایک روحانی رشتے میں بندھ گئے تھے۔ اُن دونوں کی بیس اکیس برس کی عمر کا یہ وہ زمانہ تھا جسے لوگ جوانی کی راتیں مُرادوں کے دن کہا کرتے ہیں۔ وقار کی جذباتیت اور رومانیت کے ساتھ اُس کی خود بینی و خود آرائی کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا ہے کہ 'اورینٹ کے ٹائلٹ میں جا کر جتنی بار وہ اپنی شکل دیکھتا تھا، شاید ہی اور کوئی دیکھتا ہو۔' وہ مغربی موسیقی کا دیوانہ تھا۔ مجتبیٰ حسین نے اُس کے گھر میں سنی بیتھون، موتزارٹ، باخ واگنسر، چیکووسکی کی سمفنیوں کو اپنی عمر عزیز کی بہترین ساعتوں اور ساعتوں میں شمار کیا ہے۔ مسیح انجم بھی مجتبیٰ حسین کے اورینٹی ساتھی تھے، جن کے بارے میں مصطفیٰ کمال نے فقرہ چست کیا تھا کہ 'مسیح انجم اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین کی دوستی نہیں چھوڑ سکتے۔' 7؎

طیب انصاری ایک زمانے میں 'ط انصاری' کے نام سے اردو رسالوں میں مضامین لکھا کرتے تھے اور مجتبیٰ حسین اسے کتابت کی غلطی محمول کرتے ہوئے انھیں ظ انصاری کے مضامین سمجھ کر پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے ان مضامین کے معیار سے چڑ کر ظ انصاری کو ایک شکایتی خط بھی لکھ بھیجا تھا۔ ایک دن کسی نے انھیں اورینٹ ہوٹل میں طیب انصاری سے روبرو کراتے ہوئے جب یہ بتایا کہ وہ رسائل میں ط انصاری کے نام سے مضامین لکھ رہے ہیں تو اس وقت کی اپنی دلی کیفیت انھوں نے ان لفظوں میں بیان کی تھی کہ 'اب آپ سے کیا چھپاؤں کہ مجھے اس وقت ط انصاری سے مل کر ظ انصاری سے کتنی خوشی ہوئی تھی۔

اورینٹ ہی میں مجتبیٰ حسین نے عوض سعید اور شاذ تمکنت کی والہانہ ملاقاتوں اور باتوں کا مشاہدہ کیا تھا اور عوض سعید کی شاذ سے بڑھی ہوئی وابستگی کو دیکھ کر انھوں نے 'شاذ کا سٹیلائٹ' کا فقرہ کسا تھا، جو یاروں میں چل گیا تھا۔ اسی ہوٹل کی میز پر انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ شاذ کی نمایش پسندی کو زک بھی پہنچائی تھی اور وہ روٹھ کر چلا گیا تھا۔ اورینٹ ہی کے ساتھیوں میں سعید بن محمد نقش بھی تھے، جنھوں نے حیدرآباد کے جریدے 'برگ آوارہ' میں ادیبوں اور شاعروں کے دستخطوں کی بنیاد پر تصویریں بنانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اُنھوں نے مجتبیٰ حسین کے دستخط کی لکیروں سے شیر کی شکل بنادی تھی اور شاذ تمکنت کے دستخط کو تختۂ مشق بنا کر چوہا برآمد کرلیا تھا۔ مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ شاذ تمکنت نرگسیت کی حد تک خود بین و خود آرا تھے۔ ایک دن وہ اور مجتبیٰ حسین اورینٹ میں بیٹھے تھے کہ سعید بن محمد نقش (ہاتھ) آ گئے، پھر شاذ کو تو بپھرنا ہی تھا، لیکن بھلے بھانتی بات سمبھال لی گئی۔

یوں تو حسن عسکری اور مخدوم محی الدین سے مجتبیٰ حسین پہلے پہل ہوٹل ویکاجی میں ملے تھے لیکن اُن کی دوستی اور ینٹ میں پروان چڑھی تھی۔ مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ مخدوم سے جب بھی کوئی نئی غزل سرزد ہوتی تھی تو وہ فوراً اُسے سنانے کے لیے نکل پڑتے تھے کہ کہیں نہ کہیں تو کوئی مائی کا لال (سامع) مل ہی جائے گا۔ پہلے وہ اور ینٹ ہوٹل پہنچتے، اگر وہاں کوئی نہ ملتا تو دفتر 'صبا' جاتے اور وہاں بھی کوئی ہاتھ نہ آتا تو چائنیز بار چلے جاتے تھے۔ اور ینٹ کی میزوں پر اپنے نظریات کی بحث کرتے ہوئے مخدوم کی تصویر مجتبیٰ حسین نے یوں کھینچی ہے کہ 'مٹھیاں بھینچی ہوتی تھیں، منہ سے کف نکل رہا ہوتا تھا اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے مخدوم بہت احتیاط سے استعمال کرنے کی چیز تھے۔' اسی اور ینٹ میں وہ ڈاکٹر یوسف علی خاں سے ملے اور یہیں ان کی ایم اے علیم سے ملاقاتیں رہیں جو کہ پبلک اڈمنسٹریشن کے شعبے میں لکچرر ہوئے۔ یہیں وہ نہایت وسیع المطالعہ شمس الزماں سے روشناس ہوئے جو کہ 'آزاد ہند' (کلکتہ)، 'آئینہ' (بمبئی) اور 'سیاست' (حیدرآباد) جیسے اخباروں سے وابستہ رہے تھے۔ راشد آزر بھی اُن کے ایک 'اور ینٹی بھائی' تھے جو عموماً سلیمان اریب کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ اسی ہوٹل میں اُنھوں نے اپنے کالج کے ساتھی یوسف امتیاز کے ساتھ کتنی ہی صبحیں اور شامیں گزاری تھیں اور بعد میں انھیں پتا چلا تھا کہ یوسف امتیاز، مرزا فرحت اللہ بیگ کے بھتیجے تھے۔ مجتبیٰ حسین نے عزیز قیسی کے بارے میں لکھا ہے کہ اُن سے ان کا تعلق محض دعا سلام ہی تک رہا تھا اور جب عزیز قیسی اور ینٹ میں داخل ہوتے تھے تو وہ اور اُن کے ساتھی عزیز قیسی کی چال سے اُس کے چال چلن کا سُراغ لگانے لگ جاتے تھے۔

مجتبیٰ حسین کے اور ینٹ کے ساتھیوں میں سلیمان اریب کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ اریب کے متعلق اُنھوں نے کئی لطیفے وضع کر رکھے تھے، جنھیں اریب خود نہ صرف بہ اصرار بلکہ بہ تکرار سُن سُن کر قہقہے لگایا کرتے تھے۔ جب کبھی کوئی ادبی شخصیت یا کوئی مہمان اُن سے ملنے آتا تو وہ مجتبیٰ حسین کو اکبر اعظم کی طرح حکم دیتے کہ وہ ان لطیفوں کو مہمان کو بھی سنا کر خندہ بار کریں۔ مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ اُنھیں ملّا دوپیازہ کی طرح اُن کی فرمایش پوری کرنا پڑتی تھی اور کئی بار سنائے ہوئے اُن لطیفوں کو بار بار دہرانے سے اُن کا منہ اس طرح کا بن جاتا تھا جیسے کہ اُنھوں نے ارنڈی کا تیل پی لیا ہو۔ معترضہ طور پر عرض ہے کہ صرف اُن کے خاکوں ہی میں کم از کم نصف درجن مختلف مقامات ایسے آئے ہیں، جہاں اُنھوں نے ارنڈی کا تیل پیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے منہ کا مزا بگڑنے کی نسبت سے اپنے پسندیدہ محاورے کا استعمال کیا ہے۔

انھوں نے 'قصہ مختصر' میں کہیں لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ سے دوستوں کے رسیا اور متوالے رہے ہیں اور اپنے وقت کا بڑا حصہ دوستوں میں گزارتے ہیں۔ ان کے کالجی دور میں ظاہر ہے کہ ان کی وقت گزاری کا خاص اڈا اور ینٹ ہوٹل ہوا کرتا تھا، جہاں وہ اپنی گل افشانیِ گفتار سے جانِ محفل بنے رہتے تھے۔ ان کے دوستوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ اس دور میں اور ینٹ کے پھیرے کرنے کے لیے ان کے پاس ایک اسکوٹر ہوا کرتا تھا۔ ان کے اور ینٹی ساتھیوں میں ایسی کئی غیر ادبی شخصیتیں بھی ہیں، جنھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک ظرافت نگار ہیں، مجتبیٰ حسین کے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا ظرف دکھایا تھا، بعد میں ان میں سے کئیوں کو آئی اے ایس کے عہدے اور کئی ایک کو آندھرا کی حکومت میں وزارتیں پانے کا شرف حاصل ہوا۔

ہوٹل اور ینٹ کی یاد میں مجتبیٰ حسین نے ایک فکاہیہ 'ہوٹل شبانہ' کے نام سے لکھا تھا، 8 جو کہ اُن کی پینتالیس برس قبل

شائع ہوئی کتاب 'قصہء مختصر' میں شامل ہے۔ انھوں نے ظریفانہ انداز میں لکھا تھا.....'ہم نے اس ہوٹل کی زندگی میں ہی اس کا نام 'مرحومہ ہوٹل رکھ چھوڑا تھا کیونکہ اس ہوٹل میں زندگی کے سوا سب کچھ موجود تھا۔ وہی بوجھل بوجھل سی فضا، وہی تھکا تھکا سا ماحول، بات بات پر جماہیاں لیتے ہوئے بیرے، اونگھتے ہوئے گاہک، اجڑے اور لٹے ہوئے شوکیس،.....فرنیچر کی وہی بے رونقی اور زبوں حالی۔ ہوٹل کے کوریڈور کا سناٹا جو دوپہروں میں زیادہ شدید ہوجایا کرتا ہے۔.....ایسی افیونی فضا، ایسا چیختا سناٹا، ایسی خواب آور کیفیت ان لوگوں کو بہت راس آتی ہے جو دانش وروں، ادیبوں اور شاعروں کی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔'(ص:89-88)

مزید رقم طراز ہیں کہ 'اکثر طلبا اعلا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے 'ہوٹل شبانہ' میں ہی داخلہ لیا کرتے تھے کیونکہ یونی ورسٹی کی تعلیم میں جو خامیاں رہ جاتی تھیں، وہ یہاں دور ہو جایا کرتی تھیں۔ پھر یہاں تعلیم کی کوئی فیس نہیں دینی پڑتی تھی۔ دن بھر میں ایک چائے منگائی تو منگائی نہ منگائی تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔' چائے کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ 'ہوٹل شبانہ' کے مستقل گاہکوں کا یہ کام تھا کہ وہ چائے پینے کے لیے عارضی گاہکوں کی تلاش کریں گویا وہ 'ہوٹل شبانہ' کے مستقل گاہک سے زیادہ اس کے ایجنٹوں کا درجہ رکھتے تھے۔ دوسری طرف اس ہوٹل کے بیروں کو اپنا حافظہ بہت تیز رکھنا پڑتا تھا کیونکہ اکثر صورتوں میں صبح کو پی جانے والی چائے کا بل شام میں ادا کیا جاتا تھا۔ لکھتے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ اس ہوٹل میں پہنچ کر بہت چھوٹا ہو جاتا تھا۔ کئی پیچیدہ بین اقوامی مسائل کے بارے میں کھٹا کھٹ فیصلے صادر کر دیے جاتے تھے، یہ اور بات ہے کہ ان فیصلوں پر کوئی عمل نہیں کرتا تھا، یوں دنیا اقوام متحدہ کے فیصلوں پر بھی کون سا عمل کرتی ہے!

مجتبیٰ حسین نے جیسی بھرپور زندگی جی ہے اور دنیا جہان کی سیر کی ہے، بلا شبہ سیکڑوں عالی شان ہوٹلوں کی مہمانی کا لطف اٹھایا ہوگا، پھر بھی درج بالا تفصیل سے ظاہر ہے کہ ان کی زندگی میں ہوٹل اورینٹ کی سی اہمیت اور اس کا سا مقام کسی ہوٹل نے نہ پایا ہو گا۔ ان کے لکھے خاکوں میں جہاں تہاں کئی اور ملکی اور غیر ملکی ہوٹلوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ مثلاً مدینے کا ''اوبرائے ہوٹل''، لاس اینجلس کا ''شاہ نواز ریسٹوران''، جہاں وہ موسیقارِ اعظم نوشاد کے ساتھ شریک طعام ہوئے تھے۔ دبئی کا ''رائل امپائر ہوٹل''، جس کے ڈائننگ ہال میں انھوں نے دلاور فگار سے آخری ملاقات کی تھی۔ (اردو کا یہ نامور ظریف شاعر اس ملاقات کے کوئی آٹھ ماہ بعد چل بسا تھا۔ اسیم) دہلی کا ''کلارجس ہوٹل'' جہاں وہ خواجہ عبد الغفور کے فرزند حسن غفور کی شادی کے استقبالیے میں مدعو تھے۔ حیدرآباد کے ''ویکاجی'' کی چند ادبی سرگرمیوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ سعید بن محمد نقش کے ساتھ ایم ایف حسین کا ایک غیر رسمی انٹرویو بھی مصنف نے کسی ریستوران میں لیا تھا۔ بیگم پیٹ کے ہوٹل کٹریہ ڈی رائل میں عقیل بن عزیز کی پینٹنگس کی نمایش میں وہ مہمان خصوصی تھے، جس کا افتتاح آندھرا پردیش کے چیف منسٹر نے کیا تھا۔ مصنف کے کسی خاکے میں حیدرآباد کی ان دو ہوٹلوں کا ذکر بھی آیا ہے جو نئے پل کے اس پار ہوا کرتی تھیں ''تفریح دکن'' اور ''ممتاز ہوٹل'' اور ان دونوں میں حریفانہ کشمکش چلتی رہتی تھی۔ ایک دن مجتبیٰ حسین نے ''تفریح دکن'' میں چائے منگوائی تو اس میں مکھی گری ہوئی تھی۔ لیکن وہاں کے بیرے نے اس مکھی کو دیکھ کر ان کی شکایت سننے سے صاف انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ تو حریف ہوٹل کی ہے۔ ''تفریحِ دکن'' کی چائے میں گرنے والی مکھیاں تو الگ نسل کی ہوا کرتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین دہلی گئے تو وہاں بھی دہلی کے پریس کلب

اور کافی ہاؤس کی محفلوں کو زعفران زار بناتے رہے اور اپنی ظرافت و شرارت کے گل کھلاتے رہے۔ یہاں حیدرآباد میں مسیح انجم کو ایک لڑکی کی آواز بدل کر فون پر فون کر کے پریشان کر دیا تھا تو وہاں دہلی کی 'رٹز ہوٹل' سے شاذ کو ایک مشہور کمپنی کا مینجنگ ڈائرکٹر بن کر نیو ایر پارٹی کے لیے مدعو کر کے حیران کر دیا تھا۔

سن 1971ء میں اورینٹ کیا بند ہوا ع خاموش ہو گیا وہ چمن بولتا ہوا۔ اورینٹ کے بند ہونے کے بعد وہ قہقہے وہ چہچہے، وہ رفاقتیں وہ رقابتیں، وہ رنجشیں وہ نوازشیں اور وہ مزے مزے کی حکایتیں سب خواب و خیال ہو گئیں۔ یقیناً اس کے بعد اُن کی زندگی کی بے رنگی اور شب و روز کی بے کیفی بھی ضرور محرک بنی ہوں گی جو مجتبیٰ حسین نے حیدرآباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اگلے ہی سال اندر کمار گجرال مرحوم کے بلاوے پر دہلی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔

ان کے ہم دمِ دیرینہ نقی تنویر جو ایک دہائی قبل ہی انگلستان جا بسے تھے، وہاں سے لکھے اپنے ہر خط میں اُن سے ہوٹل اورینٹ کا حال یوں پوچھتے تھے جیسے کہ کسی رشتے دار کا۔ اُنھوں نے اورینٹ کے بند ہونے کی خبر سُنی تو انھیں ایک درد سے بھرا ہوا پُرسے کا خط لکھا تھا۔ یہ بھی لکھا ہوگا کہ ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پُکار، میں چلّاؤں ہائے دل!

حواشی:

1: مشمولہ: 'شگوفہ' کا مجتبیٰ حسین نمبر، ص:231

2 : ص:128، 'مہرباں کیسے کیسے'، مرتبہ: سید امتیاز الدین، مطبوعہ:2009ء

3 : ایضاً ص:125

4 : ص:142، خاکہ 'ابراہیم شفیق'، مشمولہ: مہرباں کیسے کیسے

5، 6 : وحید اختر اور سید خالد قادری کے مضامین مشمولہ 'مجتبیٰ حسین۔ فن و شخصیت' 'کتاب نما' کا خصوصی شمارہ، مرتبہ ڈاکٹر محمد کاظم (نوٹ: مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے 'کہ وحید اختر کے دل کی کدورت کو پوری طرح صاف ہونے میں پورے بیس برس لگے تھے۔' عالی ظرفی کی بات یہ ہے کہ وحید اختر نے کھُل کر اپنی اس دور کی دلی کیفیت کا اعتراف کیا ہے اور ایک مدت کے بعد دونوں ہی ادیبوں نے کھلے دل سے ایک دوسرے کے کمالِ فن کو سراہا ہے۔

7: ص208، 'من موہن مجتبیٰ'، مشمولہ 'شگوفہ' مجتبیٰ حسین نمبر، مطبوعہ 1987

8: مجتبیٰ حسین نے فون پر تصدیق کی ہے کہ انھوں نے 'ہوٹل شبانہ' کے فرضی نام سے اورینٹ ہی کا تذکرہ کیا تھا۔ اسیم

ساہتیہ اکادمی

کے زیر اہتمام

ہندوستانی ادب کے معمار
کے سلسلے کی ایک کڑی

شاذ تمکنت

بیگ احساس

قیمت: 40 روپے

ملنے کا پتہ: رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ نئی دہلی 001 110
سیلس آفس، سواتی مندر مارگ، نئی دہلی 001 110

مضمون

علی احمد فاطمی

ایک ماڈرن صوفی کی کہانی

طارق چھتاری کے بارے میں لکھنا میرے لیے بے حد مشکل ہے ۔ہم عصروں اور دوستوں کے بارے میں لکھنا کیوں مشکل ہوا کرتا ہے اس کا احساس شدّت سے اب جا کر ہوا ہے __ ورنہ میں اکثر ہم عصر شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں کے بارے میں لکھتا ہی رہا ہوں۔احباب مجھ سے خوش بھی ہوئے ہیں اور ناراض بھی، ناراض اس لیے کہ میرے قلم سے اس مقدار میں تعریف نہیں نکلی جتنی کہ وہ چاہتے تھے اور خوش اس لیے کہ بعض کی میں نے مروتاً کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی تھی جس پر ایک بار ممتاز بزرگ ناقد وارث علوی نے مجھے تنبیہ کی تھی اور واضح طور پر کہا تھا کہ ادب کے ساتھ انصاف کرو دوست کے ساتھ انصاف ہو یا نہ ہو، تنقید میں دیانت داری چلتی ہے جانب داری نہیں، تب سے میں عصری ادب اور ادیب کو لے کر محتاط ہو گیا۔شاید یہ احتیاط ہی مانع رہی جس کی وجہ سے میں اپنے بیحد ہر دل عزیز دوست بلکہ علی گڈھ کی زبان میں ''جگر'' کے بارے میں اب تک کچھ نہ لکھ سکا۔حالانکہ مجھے ان سے یہ شکایت ہے کہ وہ بہت سست رفتار ہیں، کافی دنوں سے کچھ نہیں لکھا ہے اور اگر علی گڈھ کے ہی دوسرے ''جگر'' کی یہ بات مان بھی لی جائے یعنی 'قمر الہدیٰ فریدی' کے اس خیال سے اتفاق کر لیا جائے کہ __ ''موضوعات کے انتخاب میں افسانہ نگار کی احتیاط پسندی اور کسی اچھوتے پہلو کی تلاش بسیار نویسی میں مانع رہی۔'' چلئے مان لیا جائے کہ بسیار نویسی اچھی بات نہیں لیکن بسیار خاموشی کو کیا نام دیا جائے۔ 'باغ کا دروازہ' میں انیس (۱۹) افسانے شامل ہیں جو ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا اور جو بقول فریدی ''ان کے تقریباً پچیس سالہ ادبی سفر کا حاصل ہے۔'' اس اعتبار سے سال میں ایک افسانہ کا اوسط بھی نہیں پڑتا چلئے پھر بھی بسیار نویسی کے مقابلے قلّت نویسی کو بہتر مان لیا جائے __ لیکن اس مجموعہ کے بعد سولہ برس گذر چکے ہیں اس درمیان کتنے افسانے شائع ہوئے۔قریبی دوست ہونے کے ناتے کہہ سکتا ہوں کہ سال میں ایک چوتھائی افسانہ بھی حصّہ میں نہیں آتا __ ایک ناول ضرور لکھ رہے ہیں جس کے کچھ حصے ہم چند قریبی دوستوں نے علی گڈھ کی محفلوں میں سنے لیکن اسے سنتے ہوئے بھی مدّت گذر گئی۔پتہ نہیں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور ہماری کمزور ہوتی ہوئی نگاہوں سے گذر سکے گا یا نہیں __ جبکہ طارق چھتاری ایک ذمہ دار انسان ہیں۔ شریف شوہر ہیں (جو عام طور پر نہیں ہوتے) یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔کھاتا پیتا گھر ہے۔ چین ہے آرام ہے لیکن شاید یہ آرام سکون ہی مانع ہے۔کہا جاتا ہے کہ تخلیق کا کیڑا آزار میں کلبلاتا ہے پریشان کرتا ہے تب ذہن اور قلم حرکت میں آتا ہے۔اور جب جب ایسا ہوا ہے طارق کے قلم نے وہ جولانیاں بھری ہیں ایسے چونکا دینے والے افسانے لکھے ہیں کہ جن پر مدّتوں بحثیں ہوتی رہی ہیں اس کے ایک ایک پہلو پر ہم دوستوں نے طرح طرح کی گفتگو کی ہے __ اور پھر جواب میں طارق کی ٹھہری، سنبھلی اور متوازن سنجیدہ گفتگو۔ادب کی فہم اور خاص طور پر فکشن کی سمجھ غیر معمولی __ کیا کیا نعمتیں ہیں ان کے پاس لیکن کبھی کبھی یہ نعمتیں ہی زحمتیں بن جاتی ہیں۔مقدار کا معاملہ جتنا سپاٹ اور سادہ ہوتا ہے معیار کا معاملہ اتنا ہی الجھا ہوا پریشان کرتا ہوا۔طارق ادب کے معاملے میں اکثر پریشان رہے ہیں۔ذاتی ملاقاتوں اور گفتگو میں یہ پریشانی کھلی بھی ہے، لیکن آج کل بند ہے۔کیوں اتنا سنجیدہ فنکار خاموش ہے؟ کیا اسے صرف خاموشی اور تساہلی کا نام دے دیا جائے یا ادب کے نام پر غیر ادب

کا شور بے ہنگم ماحول۔ ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں کی گھڑ دوڑ، حرص وہوس۔ بازار واداسے ایک گونہ پریشان کیے ہوئے ہے۔ میں اپنے آپ کواس کا قریبی دوست ہونے کا دعویٰ تو کرتا ہوں اور یہ دعویٰ بخوشی طارق کو بھی منظور ہوگا لیکن یہ دعویٰ کر پانا مجھ سے بھی زیادہ قریبی احباب مثلاً 'سید محمد اشرف، غضنفر، صغیر افراہیم' وغیرہ کے لیے بھی مشکل ہوگا کہ طارق کے باطن میں کیا کھلبلی ہے اس خاموشی کے پیچھے کیا بے چینی ہے۔ کیا پک رہا ہے اور اگر پک رہا ہے تو وہ پک کر باہر کیوں نہیں آ رہا ہے__ باہر آنے کا خوف ہے یا خوف کی بے معنویت بے مقصدیت۔ اس راز کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے طارق کی شخصیت وذہنیت کو تو کھنگالنا ہی ہوگا نیز اس عہد کو کہ جب اس نے لکھنا شروع کیا اور آج کے عہد کو کہ جب وہ کم کم لکھ رہا ہے یا اس عہد کے بیشتر لکھنے والوں کو دیکھئے اور ان کے تیس پینتیس سالہ ادبی وتخلیقی سفر کو بغور ملاحظہ کیجئے اور اس کے بعد بدلتے ہوئے عہد بگڑتے ہوئے اقدار کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ ہمارے ہی عہد کے ممتاز ترین افسانہ نگار سلام بن رزاق نے اپنے تازہ ترین مضمون افسانہ اور عصر حاضر کے چیلنج، میں پہلے ایک جگہ یہ لکھتے ہیں:

''آج سے چالیس پنتالیس سال پہلے ادب کی اہمیت اور ضرورت ایک مسلمہ حقیقت تھی_ ایک زمانہ تھا جب ہمارے شعراء کے اشعار اور ادیبوں کے افسانے موضوع بحث ہوا کرتے تھے ان کا نام خاندانی ناموں کا حصہ ہوتے تھے مگر آج نئی نسل کی زبان پر مضمون کے ایکٹر مختلف کھیلوں کے کھلاڑی۔ سیاست داں، لطیفے باز، حتیٰ کہ بھانڈ اور میراثیوں کے ناموں کا تذکرہ ہوتا ہے۔''

اسی مضمون میں سلام نے یہ بھی لکھا:

''آج ہم ایک ہولناک صورتِ حال سے گذر رہے ہیں اور ایک تشویشناک کی مستقبل ہمارا منتظر ہے ایسی صورت میں پہلا سوال جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ آج معاشرے کی افسانے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔''

کیا یہی وجہ ہے جس نے شوکت حیات اور دیگر دوستوں کو کم لکھنے یا نہ لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیا یہی وجہ ہے جس نے غضنفر کو فکشن کے بجائے مثنوی 'کرب جاں' لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیا یہی وجہ ہے جس نے 'حسین الحق' کو ناول کے بجائے تنقیدی کتاب لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور سید محمد اشرف تہذیب کی آخری سواری پر سوار ہونے پر مجبور ہیں۔ کیا یہی وجہ ہے کہ عبدالصمد پٹنہ کی ادبی سیاست اور شورغل سے دور اقلیت کی حالت پر ماتم کناں ہیں اور کیا یہی وجہ ہے کہ طارق چھتاری مدّتوں سے خاموش ہیں۔؟ آیئے اس خاموشی کی تہہ کو تلاش کریں اور اس گفتگو کی بات کریں جہاں سے طارق کا تخلیقی سفر شروع ہوتا ہے۔

یہ ۷۶۔۱۹۷۵ء کی بات ہے میں الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہا تھا اور کثرت سے علی گڈھ آتا جاتا تھا اور مہینوں قیام رہتا۔ انھیں دنوں جن نوجوان قلمکاروں سے میری دوستی ہوئی ان میں سید محمد اشرف، غضنفر، طارق، صغیر افراہیم، پیغام آفاقی، آشیفتہ چنگیزی، مہتاب حیدر نقوی، ابن کنول، شارق ادیب، غیاث الرحمٰن وغیرہ تھے۔ ہمہ وقت انھیں دوستوں کے ساتھ گذرتا۔ شمشاد مارکیٹ کافی ہاؤس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، اسٹاف کلب اور دودھ پور کی گلیاں۔ عجب دن تھے، عجب نشہ تھا۔ شعراء خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار کے قریب تھے اور فکشن سے دلچسپی رکھنے والے قاضی عبدالستار کے قریب__ میں دونوں کے ہی قریب تھا۔ حالانکہ میں شاعر نہ تھا اور نہ ہوں۔ فکشن سے دلچسپی رہی۔ ابتداً افسانے بھی لکھے۔ اس لیے انھیں لوگوں سے دوستی زیادہ ہوئی جو فکشن سے دلچسپی رکھتے تھے جن میں طارق چھتاری بھی

تھے۔طارق اور میں ہم عمر ضرور ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں وہ کلاس میں مجھ سے پیچھے تھے جب میں ریسرچ کر رہا تھا تو وہ اردو سے ایم۔اے کر رہے تھے۔بلند شہر کے قصبہ چھتاری کے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے طارق کے والد کم عمری میں انتقال کر گئے۔دادا نے علی گڈھ میں داخلہ کرادیا لیکن جلد ہی وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔طارق کے لیے یہ ایک بڑا حادثہ تھا جس سے وہ آسانی سے نکل نہیں پائے شاید اسی موڑ پر ان کا تعلیمی سلسلہ گڑبڑایا لیکن جلد ہی وہ سنبھلے اور سائنس سے آرٹس کی طرف آ گئے۔اب وہ ہاسٹل میں تھے۔اس ہاسٹل اور اس کمرے میں جہاں کبھی علی سردار جعفری رہا کرتے تھے اور اب طارق جعفری صاحب کے بھتیجے پرویز جعفری کے ساتھ رہتے تھے بقول صغیر افرہیم ___ ''یہ کمرہ انھیں اس لیے بھی عزیز تھا کہ اس میں کئی سال تک علی سردار جعفری رہے تھے اور اب ان کا بھتیجا پرویز جعفری ان کا روم پاٹنر تھا۔''صغیر نے اپنے مضمون میں یہ بھی اطلاع دی کہ ٹھیک انھیں دنوں جب کہ وہ بی۔اے۔کے ہی طالب علم تھے انھوں نے اپنا پہلا افسانہ ''تین سال'' سنایا تھا میں نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اس لیے دعویٰ سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن عنوان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک نوجوان کے وہی تین سال رہے ہوں گے۔جب دادی دادا، والد سبھی بزرگوں کا سایہ آگے پیچھے اٹھ گیا اور طارق اس دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ان کے والد بھی اپنے بھائیوں میں اکیلے تھے۔اور آج طارق کا بیٹا بھی اکیلا ہے۔یہ اکیلے پن کی روایت اور کفایت شعاری کی عادت خاندانی ہے جس پر طارق چلتے رہے چلتے رہے پھر کچھ ایسی عادت پڑی کہ کفایت شعاری ان کی افسانہ نویسی کو بھی متاثر کر گئی۔خاندانی وضعداری اور روایت کی پاسداری طارق کے شعار کا تہذیبی اور نفسیاتی حصہّ ہے لیکن یہ حصہ پختہ اور بالیدہ ہو کر فطری طور پر ان کی شخصیت سے لپٹ گیا ورنہ نوجوانی اور خون کی روانی روایات سے انحراف کرنے اور الٹ پلٹ کر دینے پر مجبور کرتی ہے۔یہ منزل طارق کی زندگی میں بھی آئی۔ہوسٹل کے قریب دودھ پور کی گلی میں پروفیسر مختار الدین احمد آرزو رہا کرتے تھے ان کی خوبصورت نرم و نازک بیٹی جو سرو سمن کی نازک بیل کی طرح تھی اچانک ان کے جسم و جان سے لپٹ گئی اور کائناتِ روح بن گئی __یہ واقعہ غالباً ۱۹۷۵ء کے آس پاس کا ہے۔مجھے یاد نہیں کہ پُر مسرت تقریب میں میں شریک ہوا تھا یا نہیں لیکن جب طارق مع اپنی بیگم اسی گھر کے ایک حصہ میں رہنے لگے تو میری حاضری برابر ہوتی اور یاسمین بھابی کے ہاتھوں کی چائے و دیگر اشیاء پینے کھانے کے ہزار ہا موقع ملے۔اس زمانے کا علی گڈھ بہت سر گرم تھا۔جدیدیت کا شور و زور تھا۔ طارق کے قلم کا بھی زور تھا __مجھے یاد ہے کہ انھیں دنوں میں نے ''سنڈے کلب''میں ان کا افسانہ دس بیگھے کھیت سنا تھا۔کچھ کہانیاں انھوں نے ''کارواں کلب'' میں بھی سنائی تھیں۔دس بیگھے کھیت کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔کہ اس کہانی کا تعلق دیہات اور قصبات سے ہے۔طارق کا تعلق بھی کھیت باغ اور دیہات سے رہا ہے پھر ان دنوں قاضی عبدالستار کے افسانوں کا بھی اثر تھا___ پھر وہ ان اثرات سے باہر بھی نکلے۔مجھے یاد ہے کہ شارق ادیب یا اسعد بدایونی کے کمرے میں ایک محفل ہوئی تھی جس میں طارق نے افسانہ سنایا تھا وہ بالکل جدید رنگ میں تھا۔ہم سب نے بے باکی سے اپنے اپنے خیالات پیش کئے لیکن جب طارق کی باری آئی تو انھوں نے بھی صاف گوئی سے کہا کہ آپ لوگوں کی آراء کا شکریہ لیکن میں ان آراء سے اتفاق اس لیے نہیں کرتا کہ میں نے یہ باتیں نہیں کہی ہیں آپ لوگوں نے کیسے سمجھ لیں۔میں نے تو کچھ اور کہا ہے۔پھر وہ اندر کی باتیں باہر لانے لگے جس سے ہم لوگ متفق نہیں ہوئے___ خوب بحث ہوئی۔شارق تو بحث کرنے اور تیز تیز بولنے میں ماہر تھا۔آج سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے لیکن اس ہنسی میں جدیدیت کی وہ تجریدیت پوشیدہ تھی جو اس زمانے

میں فیشن بنی ہوئی تھی کہ تخلیق آسانی سے سمجھ میں نہ آنے پائے۔ابہام،تذبذب اور کم فہمی بلکہ کج فہمی جدیدیت کے عناصر سمجھے جاتے تھے۔آج وہ سارے افسانہ نگار اس نقصان کا اعتراف کرتے ہیں جس کا وہ خود شکار ہوئے تھے۔آج سلام بن رزاق افسانہ کے تعلق سے عمدہ و سنجیدہ باتیں کر رہے ہیں اور اس حد تک لکھ رہے ہیں__ ''ادب میں تجربوں کی بڑی اہمیت ہے اگر ادب میں تجربے نہ ہوں تو سارا ادب بھوانی کی اس تلوار کی مانند ہو جائے جو لندن کے برٹش میوزیم میں سجا کر رکھی گئی ہے۔قابلِ احترام،متبرک اور عظیم مگر بے مصرف۔ادب میں تجربے یقیناً مستحق ہیں مگر تجربہ وہی زندہ رہتا ہے جس کا خمیر زندہ فن کی روایت سے اٹھا ہو۔جدّت کے نام پر ٹوپی سے خرگوش نکالنا شعبدہ گری تو ہو سکتی ہے تجربہ ہرگز نہیں__''یہی ''ہرگز نہیں'' لکھنے والے آج کے سلام بن رزاق کل جدیدیت کے اثر میں ننگی دوپہر کا سپاہی جیسے افسانے لکھ رہے تھے۔حسین الحق،عبدالصمد،انور قمر،بیگ احساس یہاں تک کہ طارق چھتاری بھی اسی کا شکار رہے۔یہ ایسی کوئی بری بات نہیں کہ ماحول کا اثر تو کچھ نہ کچھ پڑتا ہی ہے لیکن یہ سارے کہ سارے جلد ہی اس ماحول سے نکل آئے اور کچھ بہت اچھے تجربے سے بھرے ہوئے افسانے لکھے جس نے یقیناً اضافے ہی کیے۔ہر منفی شے کا ایک مثبت پہلو بھی ہوتا ہے اگر ایک سنجیدہ افسانہ نگار کی اس پر نظر ہے تو تبدیلی آنا ناگزیر ہے۔اور جو اڑیل ہوتے ہیں وہ قمر کی طرح ڈوب جاتے ہیں۔قصہ پارینہ بن جاتے ہیں۔یہ کہنا کہ طارق پورے طور پر جدیدیت کے اثر میں رہے شاید غلط ہوگا۔ماحول کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور رہا ہوگا لیکن بہت کچھ طارق کا اپنا ہے۔اس لیے کہ طارق میں وہ کمزوری ہے ہی نہیں کہ وہ فیشن کا شکار ہو جائیں۔سیلاب میں بہہ جائیں۔اس لیے کہ طارق ابتدا سے ہی سنجیدہ اور سوچنے والا ذہن رکھتے ہیں اور لحاتی تبدیلی کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتے انھیں ادب اور فکشن کی دائمی قدروں کا احساس و شعور کل بھی تھا اور آج بھی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ افسانہ کو صرف قصّہ کہانی اور راجہ رانی کی حدوں تک محدود نہیں سمجھتے۔بلکہ اس میں فکر و فلسفہ تلاش کرتے ہیں اور پیش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کم ضرور لکھا لیکن جو کچھ لکھا وہ اتنا پختہ اور بالیدہ ہے کہ اس پر ہم سبھی احباب مسلسل گفتگو کرتے ہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب طارق خود اپنے افسانہ پر بات کرتے ہیں تو ایک کیا کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں یہی روّیہ ان کا دوسرے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو لے کر ہے کہ جس وقت وہ اظہارِ خیال کرتے ہیں ہم حیران بلکہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ہماری اس حیرانی میں طارق کی بلاغت اور ذہانت پوشیدہ رہتی ہے اور یہ بھی کہ وہ ادب کو افسانہ کو کس قدر سنجیدگی اور گہرائی سے لیتے ہیں۔ایسا اس لیے بھی ہے کہ طارق نرے فنکار نہیں ہیں وہ اسکالر اور دانشور بھی ہیں۔صغیر افراہیم نے درست لکھا ہے:

''طارق چھتاری ہمارے دور کے ممتاز افسانہ نگار اور سنجیدہ نقاد ہیں۔کئی کہانیوں کے اچھے تجزیے کیے ہیں۔افسانہ نگاری اور مابعد جدید افسانہ پر فکر انگیز مضامین لکھے ہیں۔ان کا تحقیقی کام جدید اردو۔ہندی افسانے پر سند کی حیثیت رکھتا ہے۔''

اور یہ بالکل صحیح ہے۔ہندی ادب کے افسانوں کا مطالعہ بھی خوب ہے انھوں نے انگریزی فکشن بھی پڑھ رکھا ہے۔مجھے یاد ہے جب ریڈیو کی ملازمت میں آئے اور گورکھپور میں تھے تو ریڈیو کی طرف سے انھوں نے کئی سال بڑے مذاکرے کیے جس میں اس وقت کے اردو /ہندی کے بڑے فکشن رائٹرز شریک ہوئے تھے۔مثلاً امرکانت ،رویندر کالیہ،ممتا کالیہ،کے۔پی ۔سنگھ وغیرہ اس طرح اردو میں قاضی عبدالستار، سید محمد عقیل ، نیز مسعود اور بہت سارے ہم جیسے نوجوان__ کیا مذاکرے تھے۔کیا مقالے اور کیا

بحثیں، طارق ہرچند کہ منتظم تھے اوران کی غیر معمولی انتظامی صلاحیت تو دیکھنے کو ملی ہی لیکن ہندی افسانوں اورافسانہ نگاروں سے متعلق ان کی غیر معمولی واقفیت نے ہم سبھی کو چونکایا اس واقفیت نے بھی ان کو اکثر پریشان کیا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی دیگر زبانوں اور بالخصوص ہندی زبان میں طرح طرح کے عمدہ افسانے لکھے جارہے ہیں جس طرح ان کا کینویس وسیع ہے اردو کا کیوں نہیں ہے؟اس موضوع پر طارق نے مجھ سے ذاتی طور پر کئی بار تبادلۂ خیال کیا ہے ۔خیر یہ الگ سی بحث ہے جس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے جو پھر کبھی کی جائے گی__ لیکن یہ تو اندازہ ہوتا ہی ہے کہ طارق لکھتے ضرور کم ہیں لیکن سوچتے زیادہ ہیں۔ان کا ذہن اوروژن اردو کے دیگر جلد باز اوراشتہار باز افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔گمبھیر اور سوچتا ہوا جو ظاہری نمائش اورتصنع سے دور باطن میں اپنی دنیا سجاتا ہے۔آپ ان کے چند افسانے پڑھئے میری بات اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔آپ مجموعہ کے عنوان کو ہی ملاحظہ کیجئے باغ کا دروازہ اور کتاب کے سرورق کو بھی بغور ملاحظہ کیجئے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی کہانیاں (Folk stories) درآئی ہیں۔داستان کا ساتحیّر وتجسس _ لیکن مسئلہ جدید سے جدیدتر _قدیم وجدید،تہذیب وثقافت کی رنگارنگ آمیزش نے ایک باغیچہ کی شکل اختیار کرلی ہے جس میں رنگ برنگے پھول ہیں لیکن آج کے تعصب وتنگ نظری نے باغ کو ایک ہی رنگ میں بدل دینے کی کوشش کررکھی ہے۔جب ان کی کہانی 'نیم پلیٹ' چھپی تو بڑے چرچے ہوئے۔یہ کہانی دہلی اردو اکادمی کے ایک بڑے سیمینار میں پڑھی بھی گئی اوراس پر حامدی کشمیری جیسے بڑے نقاد نے تجزیہ بھی کیا لیکن وہ تجزیہ ایک خاص قسم کا تھا جس نے پورے طور پر کہانی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اس لیے کہ نیم پلیٹ صرف گھر کی نہیں فرد کی بھی پہچان ہوا کرتی ہے اوراس دوڑتے بھاگتے دور میں شخص کی گمشدگی کا جو مسئلہ آن پڑا ہے وہ بظاہر انفرادی سا لگتا ہے لیکن بغور دیکھئے تو آج یہ قوم ملک ومعاشرہ تک پھیل گیا ہے۔طارق اتنے شریف اور شرمیلے انسان ہیں کہ جنس یا سیکس کی بات کیجئے تو اپنی بیگم سے زیادہ شرما جائیں گے۔ایک لڑکی کی طرح جسے بار بار چھیڑنے کو جی چاہے لیکن جب یہ احساس ہوجائے کہ یہ تو پہلے ہی سے چھڑے ہوئے ہیں تو ان پر ترس اورحم آنے لگتا ہے۔بات کا رخ بدلنا پڑتا ہے۔ وہ گورکھپور اوردہلی میں اکثر اکیلے رہے ہیں شریف سلیقہ مند گھرانے کی بہو بیٹی کی طرح__ بیگم ان سے بھی زیادہ مہذب اور منظّم خاتون ہیں۔طے کرنا مشکل ہے کہ میاں بیوی کے درمیان کون زیادہ مہذب ہے اور کبھی کبھی یہ طے کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان دونوں میں کون میاں ہے اورکون بیوی۔بہرحال میاں بیوی کا یہ حسین جوڑا قابلِ رشک ہے اور قابلِ تقلید بھی۔خدا ان دونوں کو نظر بد سے بچائے۔ایسے شرمیلے شخص اورفن کار نے جنس اورسیکس پر چند بہترین کہانیاں لکھی ہیں جن میں گلوب کا جواب نہیں امیر گھرانے کی عورت کی جنسی جبلّت اور ملازم کی حیثیت __ صرف جنسی جبلّت کو ہی نہیں پیش کرتی بلکہ طبقاتی فرق سے وابستہ بلاوجہ کی Ego کو بھی جنم دیتی ہے اورافسانہ جنسی جبلّت اورطبقاتی حقیقت کے ملے جلے جذبات کو بخوبی پیش کر جاتا ہے۔افسانے اور بھی ہیں جنھوں نے شہرت پائی مثلاً 'کھوکھلا پہیہ'، 'شیشے کی کرچیں'، 'پورٹریٹ' وغیرہ لیکن ان کا ایک افسانہ ایسا ہے جس کو پڑھ کر میں کئی رات ٹھیک سے سو نہیں پایا اوروہ ہے 'لکیر'__ یہ اس زمانے کا لکھا ہوا افسانہ ہے جب جدیدیت اورفرقہ واریت دونوں عروج پر تھے۔فرقہ واریت تو خیر آج بھی عروج پر ہے۔لیکن یہ افسانہ فرقہ واریت سے زیادہ صدیوں کی انسانیت ،محبت کو سمیٹتا ہے۔جنم اشٹمی کا تہوار گاؤں کا ماحول برسوں سے بھگوان کرشن کا رول ادا کرتا ہوا ایک مسلم لڑکا__ لیکن اس بار کنھیا بننے پر سوال اورحمید کا یہ جمال__ ''اللہ

میاں جلدی سے جنم اشٹمی آئے اور میں مکٹ پہن کر کنھیا بنوں اور بانسری۔' لیکن یہی جمال جب سوال بنتا ہے اور خواب حقیقت تو معاملہ صدیوں پر پھیل جاتا ہے۔ اب لڑکا ہندو ہونا چاہئے۔ یہ اب کتنا خطرناک ہو چکا ہے۔ بزرگوں کے اصرار پر حمید کنھیا تو بن گیا لیکن جب مسجد کی طرف سے پتھر آیا جس نے کرشن بھگوان کے ماتھے پر خون کی لکیر کھینچ دی۔ اس خون سے آرتی کا دیا بجھ گیا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے خود ہندوؤں نے بھگوان کرشن پر اس لیے حملہ کر دیا کہ وہ مسلمان ہے اور اس طرح بھگوان کا اپمان ہوا ہے اور پھر بات بڑھتی گئی حمید کے سر پر وار ہوا اور کہانی ان جملوں پر ختم ہوتی ہے:

''مکٹ کا چھنی اور بخنتی مال پہنے کرشن بھگوان ڈولے سے نیچے لڑھک پڑے اور دھرتی پر خون کی ایک لکیر بہت دور تک کھنچتی چلی گئی۔ کچھ لوگ لکیر کے ادھر تھے اور کچھ لوگ ادھر۔ دونوں طرف شور تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ لکیر کے ادھر زیادہ شور ہے یا ادھر___''

جو لوگ زندگی، انسان اور انسانی معاشرے سے سنجیدہ اور جذباتی تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کہانی بیحد اثر انگیز ہے لیکن جو لوگ ادب کو کتابی اور نصابی انداز سے لیتے ہیں انھیں یہ کہانی لاؤڈ لگے گی۔ نعرہ بازی بھی لگ سکتی ہے اور شاید لگی بھی ہے اسی لیے اس کہانی کا ذکر زیادہ نہیں ہوا، جدید نقادوں نے تو اس پر بات نہیں کی اس لیے کہ ایسے موضوعات کو ہنگامی موضوعات کہتے ہیں جو سماجی اور خارجی ہوتے ہیں۔ طارق چھتاری کبھی ان بحثوں میں نہیں پڑے وہ تو بس اس کے قائل تھے کہ ''شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو'' لیکن سچ یہ ہے کہ طارق کا املا غلط نہیں ہے وہ شعر اور فنِ شعر کے ضرور قائل ہیں اس طرح ان کی نظر میں افسانہ پہلے افسانہ ہونا چاہیے خواہ وہ بیانیہ ہو یا علامتی۔ طارق نے دونوں طرح کے کامیاب تجربے کیے کہ مسئلہ علامت یا تجریدیت کا نہیں ہوتا اصل معاملہ یا مقدمہ تو مشاہدہ اور تجربہ کا ہوتا ہے اور پھر روّیہ اور نظریہ کا۔ نظریہ سے مطلب نظریۂ ادب اور نظریۂ حیات کا۔ ادب ایک سنجیدہ و مقدس عمل ہے۔ طارق نے زندگی کی طرح ادب کو بھی پوری سنجیدگی سے لیا ہے۔ ذاتی زندگی میں ان کی تہذیب، اخلاق، اخلاص، نرم گفتاری، ملنساری کے سبھی قائل ہیں۔ چونکہ میں ان کے افسانوں پر تفصیل سے الگ مضمون لکھ رہا ہوں اس لیے ان کے فکر و فن پر باتیں الگ ہیں یہ تاثراتی نوعیت کا مضمون تو اپنے افسانہ نگار دوست کے تئیں محبت بھرا نذرانہ ہے جس کے ایک ایک ورق ایک ایک لفظ پر چالیس سال کی داستانِ محبت رقم ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ ان چار دہائیوں کے طویل عرصہ میں ہمارے درمیان کبھی کوئی تلخ بحث ہوئی ہو یا کوئی بات ناگوار گذری ہو۔ کبھی کبھی تو اسی بات پر غصّہ آتا تھا کہ یہ شخص بحث کیوں نہیں کرتا۔ علی گڈھ میں رہتے ہوئے اسے ''علی گڈھ'' نہیں ہوا۔ کبھی کبھی تو اس کے علیگ ہونے پر شبہہ ہونے لگتا ہے___ لیکن سچ پوچھئے تو طارق ہی سچا علیگ ہے ورنہ لمبی مدّت سے علی گڈھ میں رہتے ہوئے بھی کوئی سید ہے، کوئی انصاری ہے کوئی بہاری اور کوئی غیر بہاری ___ لیکن طارق تو چھتاری ہے۔ چھتنار درخت کی طرح پھیلا ہوا۔ مہکتا ہوا۔ دوستوں کا دوست، دشمنوں کا بھی دوست۔ گاڑی سے اسٹیشن پہنچانا اسٹیشن سے لے آنا۔ گھر میں دعوت کرنا۔ عمدہ قسم کی چائے پلانا اور نزاعی قسم کے افکار و افراد پر لب بند رکھنا بڑے ظرف کام ہے جو بڑے بڑے نہیں کر پاتے لیکن طارق یہ بڑا کام بڑی آسانی سے کر جاتے ہیں۔ طارق الہ آباد بھی آتے رہتے ہیں اور میں بھی علی گڈھ جاتا رہتا ہوں۔ میرے لیے طارق اور علی گڈھ لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے بیٹے کی شادی میں میں شریک ہوا میری بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے وہ الہ آباد آئے۔ کوئی حساب نہیں کوئی سوال جواب نہیں۔ حساب کتاب اور نفع نقصان کے اس دور میں طارق

میرے ایسے دوست ہیں جہاں صرف جذبہ ہے خلوص ومحبت ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب گذشتہ برس علی گڈھ کے ہی ایک اعزازیہ جلسہ میں طارق کونوازا گیا تو پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ایسا کیوں نہ ہو وہ آفیسر ہے اور نہ ہی وائس چانسلر۔بس ایک شریف ،سادہ اور پیارا انسان ہے۔دلنواز شخصیت کا مالک ہے۔اس کی شخصیت میں غیر معمولی جاذبیت ہے جو وقت کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔لیکن میں پھر بھی سوچتا ہوں کہ اتنی فیاضی سے خلوص ومحبت اور دوستی تقسیم کرنے والا شخص ان دنوں اپنے قلم کو لے کر خاموش کیوں ہے یہاں فیاضی کیوں نہیں۔کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ہوسکتا ہے کہ دوسرے فیاض قسم کے قلمکاروں کا حشر دیکھ رہا ہو یا پھر سلام بن رزاق کا وہ خیال پریشان کررہا ہو کہ آج سماج کو افسانہ کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ میرے ذہن میں تو ایک تیسرا خیال بھی آتا ہے۔بس خیال ہے قیاس اور لطفِ احساس کہ طارق کے والد اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔طارق اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے اور طارق کا بیٹا بھی اکیلا اور اکلوتا شاید اسی لیے طارق کا افسانوی مجموعہ بھی ایک۔طارق کا ناول بھی ایک۔طارق کی تنقیدی کتاب بھی ایک۔اس ''ایک'' نے ہی انھیں لاشریک دائرے میں سمیٹ لیا ہوا اور وہ جذب ووجد کے عالم میں پہنچ گئے ہوں جہاں وحدانیت کے تصوّر میں اضافہ ہوگیا ہو اور وہ ایک ماڈرن صوفی بن گئے ہوں۔ان کی باطنی پاکیزگی اور مہذّب خاموشی تو کچھ یہی اعلان کرتی ہے۔طارق کے لباسِ ظاہری پر نہ جایئے۔ان کی خوبصورت شخصیت پر بھی نہ جایئے۔ان کے باطن کی طہارت کو دیکھئے۔ان کی شرافت اور محبت کے دروازے میں جھانکئے جہاں باغ ہی باغ ہے۔جہاں ہرے بھرے احباب ہیں تبسم ریز انسان ہیں۔سنہرے افراد اور زرّیں افکار کی دنیا آباد ہے۔جب کبھی بھی باغ کا دروازہ کھلتا ہے تو جنت کا منظر ہی دکھائی دیتا ہے۔اس ارضی جہنم سے تھوڑی دیر کے لیے بچنا ہے تو طارق سے دوستی کیجئے اور اگر دوستی نصیب نہ ہو ان کی تخلیقات پڑھئے جہاں ان کا باطن ملے گا۔پاکیزہ وگہرا باطن،خارج اور باطن کا ایسا شفاف ومعنی خیز امتزاج آج کے دور میں عنقا ہے۔اسی لیے طارق کی شخصیت ہیرا ہے اسی لیے میں اس کو ماڈرن صوفی کہتا ہوں اور اسی لیے میں نے اس مقالہ کا عنوان بھی یہی قائم کیا ہے۔طارق چھتاری کے افسانے۔افسانوی ادب میں جو بھی درجہ رکھتے ہوں یہ وقت طے کرے گا لیکن طارق کی دوستی اس کے دوستوں کے لیے عظیم سرمایہ ہے۔کاش کہ اس عظیم سرمائے میں کچھ اور نگینے جڑ جائیں۔کچھ اور مقالے__ آیئے ہم سب مل کر دعا کریں اور سرسید سے شکایت بھی کریں کہ آپ کے دیار میں آپ کے مخالفین اور حاسدین آج بھی ہیں انھیں کے درمیان ایک ایسا ماڈرن صوفی بھی موجود ہے جو شہرت ونمائش سے کوسوں دور ہے اسی لیے نقادوں۔دانشوروں اور چودھری نما پروفیسروں کی نظروں سے بھی دور ہے لیکن دوستوں کی نگاہوں میں وہ روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔کاش اسے بھی کوئی نیا حالی مل جائے اور ایک نئی حیاتِ جاوید لکھ دے__ جس کی سخت ضرورت ہے۔

OOO

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات idarasabras@yahoo.in پر بھیج سکتے ہیں۔

مضمون

اُردو شاعری کا آٹھواں در: نسیم سیّد

شاعری نام ہے سات زمینوں اور سات سمُندروں کے طواف کا یا پھر نام ہے زمین کی گہرائیوں سے نکل کر آسمان کی وُسعتوں تک پھیل جانے کا-

شاعری نادیدہ سے دیدہ حقیقتوں کے لئے اشاریہ تیار کرنے کا نام ہے یا پھر نام ہے جُنوں کے اُس معراج کا جہاں زمین سُورج کے ارد گرد گھُومتی رہتی ہے اور " اندھیارے- اُجیارے " صحیفے میں ،خلق کی عبارت لکھتے رہتے ہیں- جب اُنگلیوں میں پھنسے قلم کو جوار کے دانے جیسے حرُوف سے مُحبّت ہوجاتی ہے تو حرُوف کبھی نظم بدن ،غزل بدن اور مٹی بدن ، داستان رنگ صُورت لئے سامنے آتے ہیں-مٹی کی سوندھی سوندھی خُوشبو جن کے ذہن اور دماغ میں بسیرا کرتی ہے وہ اس مٹّی کے اسرار ورمُوز سے واقف ہوتے ہیں اور لکیروں کو بُطلان کرنے کی حلاّج ادائیں بھی ان کے ساتھ ہوتی ہیں-نسیم سید ایک ایسی ہی شاعرہ کا نام ہے، جو اپنی شاعری میں اپنے زمانے کی دھڑکنوں کو ساتھ لئے ، مابعد الطبعیاتی اور ماضی کے سنہرے ورق موضوعات کو شاعری کے دامن میں سمیٹے ،کبھی لبمل تو کبھی بارہ ابھرن سولہ سنگار نظر آتی ہیں-فرقہ ء شاعری میں ان کا عقیدہ معصُومانہ ہے جسے ترقی پسندی اور جدیدیت کی عینک سے نہیں دیکھا جاسکتا ۔

کسی بھی تخلیقی فنکار کا سب سے بڑا مسئلہ ،تخلیقی اظہار ہوتا ہے اور جب یہ اظہار یکتائی کے اُبٹن کے ساتھ ،آب چشم کو اپنی سہیلی بنا کر سفر کرتا ہے تو نسیم سیّد کے سات حرُوف اور حرُوف تہجّی کے آٹھ لفظ اُردو شاعری کے آٹھویں در کو کھولتے نظر آتے ہیں-

اکتیس دنوں کے سات مہینے ،ہفت برگ کی سات پتّیوں ، سات ہری ہری بالیوں اور سرگم کے سات سُروں کی طرح سیّدی نظمیں " ہفت ندی - موجوں " کے ساتھ میرے سامنے بہہ رہی ہے- رکوع صورت لئے اک صدا میرے قریب آئی اور پھر ایسا محسُوس ہوا جیسے ، تیز تیز چل رہی نبض کے ساتھ ،تفریحی اور نشاطی لہجے سے دُور یہ آہٹ اس گُنبد شاعری کی ہے جو طُرّہ ءگُل بھی ہے اور سیّدی مُرشدی بھی-شاید کہ یہ آواز یدطُولیٰ کی ہے یا پھر ہفت قُلزم کی -شاید کہ شاعری کی طشتری سے اُبھرنے والی یہ آواز خاندان شاعری کی اُس ملکہ کی ہے جو اُنیس فروری اُنیس سو سینتالیس سے، یک درگیر ومحکم گیر کا جاپ کر رہی ہے-

---

مجھے ایسا کیوں محسُوس ہو رہا ہے کہ حرُوف محتشم جب شاعری کی قبا اوڑھے سنجگل سے آزاد ہوئے تو نسیم سیّد کی عُمر صرف سات برس کی تھی اور اک احساس یہ بھی جاگ رہا ہے کہ ہجرت کا آٹھواں سال جب پُوراہُوا تو رُوحانی ،عرفانی ،فضائی ،زمینی سب پر مُحیط داخلیت سے خارجیت تک کے سفر میں ملنگ بنی ان کی شاعری ساتویں ڈیوڑھی پر گُم صُم ،کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی تو ہُوا یہ کہ اک تازہ ہوا کے جھونکے نے آٹھویں در کو کھولا-

آواز آئی-------

لفظوں کی پازیب پہن کر تپتی دُوپہریا میں ننگے پاؤں چلنے والی،

باوضُو , کتاب چہرہ کی تلاوت کرنے والی،

آنگن میں گم صُم سے کھڑے شجر کا قصّہ بیان کرنے والی

اے شاعرہ!

اے سیّدی!!

آدم سے ایں دم
نظم کو
دھاگوں میں یُونہی پروتی رہو
قبل اس کے کہ مسک نہ جائے پھر سے کوہ طُور کی دھڑکن-
سُنو!
شاعری محل میں رہنے والی
اے شہزادی
دُنیاؤں میں سے اک
ای جو
توہری
ادب تہذیب دُنیا ہے
وہاں شاید کہ
اب کے موسم میں
آتش جہنم بھی
حرام قرار دے دی گئی ہے-
کہیں "زندگی-عبادت" کے نئے امکانات کے سفر کی یہ شروعات
تو نہیں ؟-

نسیم سیّد، ڈھواں ڈھواں منظر میں بھی رُوحانی قُوت کے ساتھ بارُودی سُرنگ بنتے جا رہے اجسام کی حقیقتوں کو حسّیاتی وجدان کی چشم نم سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتی ہیں- جب انسانی حقوق کی ساری تنظیمیں بہت تیزی سے دم توڑنے لگتی ہیں اور دمشق کے جنوب میں پیغمبر اسلام کی نواسی سیدہ زینب کے مزار کے قریب خودکش بم حملے میں عورتیں اور بچے ہلاک ہوتے ہیں- تاریک راہوں کے مسافر کا نوالہ جب مائیں/ بیٹیاں بننے لگتی ہیں اور کروڑوں چہرے نقل مکانی پر مجبور ہوتے ہیں تو بھیگی بھیگی سی لہو میں نہائی ہوئی سیدی نظم انسانی دردوکراہ میں ڈوبے ابدان کے لہو رنگ جمالیات پیش کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے-

زینب نے سکھایا ہے ہم کو
جب بات ہو
ساتھ نبھانے کی
اور عشق میں
جان گنوانے کی
پھر پیاس کے صحرا راہ میں ہوں
یا دھوپ سفر بے محمل ہو
پھر بازو نیل ہوں، ہاتھ رسن
یا شام غریبان منزل ہو
ہم عشق میں جان گنواتے ہیں
اور عمر کی ساری پونجی
اپنے اک وعدے کے
قدموں میں دھر آتے ہیں
زینب نے سکھایا ہے ہم کو
جب اپنی مرادوں کے سارے مہتاب
پڑے ہو ٹکڑے ٹکڑے مقتل میں
اور گھور اندھیرا ہو دل میں
جب آگ لگی ہو خیموں میں
اور خوف کا اک کہرام بپا ہو
ننھے ننھے سینوں میں
ہم چھوٹے چھوٹے کرتوں کے
ادھڑے ہوئے جلتے دامن سے
مقتل میں علم لہراتے ہیں
اپنے اک ٹوٹے نیزے سے

لشکر پسپا کر آتے ہیں
اک ٹوٹے نیزے کی
ایسی ہیبت
یہ چلن
زینب سے ودیعت ہے ہم کو
زنیب نے سکھایا ہے ہم کو
جب کرسی نشینوں کی شوکت
دربار میں ٹھاٹھیں مارتی ہو
اور تخت نشیں کے ہونٹو پر
اک جیت ہنسی چنگھاڑتی ہو
ہم واقف ہیں
ہم واقف ہیں، کب طرز تخاطب کیسا ہو
ہم جانتے ہیں اظہار کی عظمت کیا شے ہے
اظہار
یقیں کی نصرت ہے
اظہار
لہو کی شوکت ہے
انکار
جلال ہمت ہے
ہم جانتے ہیں
ہم واقف ہیں
وہ کونسا ایسا لہجہ ہے
جس لہجے کی اک ٹھوکر سے
سب تخت نشیں
دو کوڑی کے ہو جاتے ہیں
زینب نے سکھایا ہے ہم کو

(نسیم سید)

ہر غزل کے اک شعر کے ساتھ طویل نظم بھی سفر کرتی ہے، زندگی کی ٹرین/ پٹری کی طرح- تعریف دونوں کی الگ الگ مگر رشتہ زمین سے جڑی ہوئی پٹری کی طرح

زمین/ پٹری

گواہ اپنے عہد کے ہر واقعات/ حادثات کی------

اپنے عہد کا چہرہ پڑھنا ہو تو اس عہد کے تخلیقی ادب کا مطالعہ ضروری ہے کہ اس صدی کے تخلیقی فنکار کی انگلیاں سچ بولتی ہیں اور ناقد------؟

ناقد کا معاملہ ادب کے قاری پر چھوڑتا ہوں، مگر قاری ہے کہاں؟؟

ہر تخلیقی فنکار ایک دوسرے کا ایماندار قاری بھی نہیں بن سکا-------

میں کیا بولوں؟

ادھ جل گگری ،چھلکت جائے ہے-

اقراء" کی کائنات میں ادھورا سا ہوں"-

یہ ادھوری سی تحریر نسیم سید کی نظم - غزل کائنات کو پڑھنے کی اک معمولی سی کوشش ہے-

ہر غزل کے ساتھ ایک نظم سفر کرتی ہے-

تعریفیں دونوں کی الگ الگ-

ادب کی مختلف صنف کی طرح !

ایک زمانہ وہ تھا جب فکشن کی تنقید، شاعری کی نظر سے کی گئی، ایک موسم ایسا ہے کہ نسیم سید کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت تخلیقی تنقید بھی شاعری کے قریب ہوئی جائے ہے- میں کا کروں، مختار کُل تو کوئی اور ہے-

::: سانجھ سمے سیدی/ شاعری چہرہ سے میرا مکالمہ :::

دل لہُو ہوتا ہے ہو، آنکھیں لہُو مت کیجیو

چاہتی ہے جو یہ دُنیا وہ کبھو مت کیجیو

رہیو محو گفتگواک آرزو سے رات دن
آرزو جب روبرو ہو، گفتگو مت کیجیو

--

جانیو اس کو تبرک بارگاہِ عشق کا
جب مسک جائے کوئی دھڑکن، رفو مت کیجیو

--

سورہء یوسف ہے وہ رخ دید کو تاکید ہو
ایسے چہرے کی تلاوت بے وضومت کیجیو

--

مدعا کہہ کر سبک سر کیجیو مت عشق کو
اس انا خو کی انا کو سر خرو مت کیجیو

--

بے نسب آواز کا مت دیجیو ہر گز جواب
اپنے لہجے کو کبھی بے آبرو مت کیجیو

--

دربدر، کاسہ بہ کف، شہرت گزیدوں کا یہ غول
ان سے عبرت لیجیو، یہ ہاؤ ہو مت کیجیو

چاک پر کیسے ڈھلا ہے کون، کس آوے کا ہے
جا نیو سب ، آئینہ پر روبرو مت کیجیو

--نسیم سید----

وہ لاشیں ڈھورہا ہوگا خدا گر وہ ہے
جو تم کہہ رہے ہو
ہے
تو پھر اس کو
دعاؤں کے قبول ورد کی فرصت ہی کہاں ہوگی؟
وہ۔۔۔۔
انسانوں کے مقتل میں
دوزانو ہچکیوں سے رو رہا ہوگا
وہ۔۔۔۔
ملبے میں دبی معصوم چیخیں
انگلیوں سے کھودتا ہوگا
وہ۔۔۔۔
لاشیں ڈھو رہا ہوگا
زمیں پہ ہر طرف بکھری ہوئی انسانیت کی
دھجیاں
بازو پہ باندھے
خون چہرے پر ملے
اس قتل گہہ میں
ناصر بنصرنا
ھل من ناصر بنصرنا
کہہ کے چیختا ہوگا

☆☆

(نسیم سید)

احساس کی فصیل پر زخمی روح کی داستان سنانے والی اس شاعرہ کو بہتی ہوئی ہواؤں کے ساتھ چلت پھرت کی عادت کبھی نہیں رہی- بیمار ہوتے جارہے معاشرے اور گم ہوتی جارہی انسانی پرچھائیوں میں نئی جان ڈالنے کی خاطر ان کی نظم تپتی دوپہریا میں اکثر ننگے پاؤں نکل پڑتی ہے-

مختلف ارواح و اجسام میں انسانی حسن کی دنیا کو

جگانے کی حوصلہ خیز جدوجہد کا عکس سیدی شاعری کی ندی کٹوری میں چھلکت جائے ہے-سیدی غزلیں جمالیاتی جذبے کی تسکین کا سبب بنتی ہیں اور ارض وطن سے محبّت کے غزل رنگ صحیفے کو پڑھنے کے لئے مجبور بھی کرتی ہیں - خارجی اور داخلی دنیا کے عناصر کو نئی زبان عطا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا- یہ کام وہی کرسکتا ہے جسے اپنے فن پر عبور حاصل ہو-نسیم سید کی غزلیہ/نظمیہ کائنات میں انسانی المناکیوں کو بھی رومانیت کی قبا مل گئی ہے-شگفتہ پیرایہ زبان کی یہ جوبن شاعری کے روایتی رنگ سے الگ چیختی ، بلبلاتی ہوئی انسانی روحوں کے آٹھویں رنگ سے مکالمہ قائم کرتی ہے کہ ہر رنگ کی اپنی زبان ہوتی ہے اور ہر زبان کی اپنی تہذیب - عرفان ذات کی متوالی یہ شاعرہ ،سسکتی ہوئی انسانیت کے نام وحدت ادیان کا جدید تر نظریہ لکھ جاتی ہیں- زندگی کی دھوپ سے پوشاک بنانے والی نسیم سید ہجوم سے عمر گزشتہ مانگتی ہیں- سیدی شاعری کا محور آج کا آدمی ہے-آدمی جو آتش فشاں بن گیا ہے-

صحرا سے نمو لیتے ہیں اور دھوپ سے پوشاک
جن پودوں پہ بارش کی عنایت نہیں ہوتی

کہیں میں بھی کر ہی نہ لوں یقیں، مرے دل سے یوں نہ خطاب کر
مجھے زندگی کی دعا نہ دے، مری عادتیں نہ خراب کر
کوء فلسفہ نہی عشق کا جہاں دل جھکے وہیں سر جھکا
وہیں زانوں موڑ کے بیٹھ جا، نہ کوء سوال و جواب کر
سب اچھا ہے۔سب کچھ ٹھیک ہے کہنا پڑتا ہے
جیسے رکھے عشق کا سائیں رہنا پڑتا ہے
تیلی بھر ایک آگ جو تھی میری راکھ میں
میں پہلے اس کو شعلہ کری پھر حیات کی

نسیم سید کو غزل ،نظم ، افسانہ، تنقید اور تراجم پر پوری قدرت حاصل ہے- اب تک ان کی کئی کتابیں آ چکی ہیں ان میں سے چند کے نام کچھ اس طرح ہیں-

آدھی گواہی (شعری مجموعہ) سمندر راستہ دے گا (شعری مجموعہ) شمالی امریکہ کے مقامی باشندوں کی شاعری (تراجم) جس تن لاگے (افسانوں کا مجموعہ) خوش گزراں گزر گئے (جون ایلیا کی شاعری اور نثر کا تنقیدی جائزہ) تیلی بھر آگ (شعری مجموعہ زیر اشاعت)

نئے رجحانات اور نئے احساسات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے نسیم سید حقائق کے چٹانوں سے غزل/نظم دنیا تراشنے میں بہت کامیاب رہی ہیں - ان کی شاعری کی اس دنیا میں دل و دماغ اور مچلتی ہوئی روح کی گونج صاف سنائی دیتی ہے-

ooo

ماہ نامہ 'سب رس' انٹرنٹ پر

www.sherosokhan.com

برقی کتب کلک کرنے پر دیکھا جا سکتا ہے۔

رعائتی نرخ پر

ادیبوں و شاعروں کی کتابوں کے اشتہارات 'سب رس' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

یٰسین احمد

زبیر رضوی بحیثیت مدیر

ادب، آرٹ، فلم اور دیگر فنون لطیفہ میں جو سنجیدہ حضرات دلچسپی رکھتے ہیں اُن سے ذہنِ جدید کی مقبولیت کا راز پوشیدہ نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس مقبولیت کا سہرا زبیر رضوی کے سر جاتا ہے۔ بحیثیت مدیر زبیر رضوی نے مذکرہ بالا فنون کی ترتیب و تدوین اور اشاعت وترویج میں غیر معمولی کام کیا ہے، جو نا صرف قابل تحسین بلکہ قابل رشک ہے۔ پچیس سال پہلے جب ذہن جدید کے پہلے شمارہ کی اشاعت عمل میں آئے تھی تو شاید زبیر رضوی نے سوچا بھی نہ تھا کہ رسالہ اس طویل عرصہ تک چلتا رہے گا۔

ذہن جدید کے شمارہ نمبر (۵۴) میں لکھا تھا۔ ''ذہن جدید اگلے شمارے کے بعد اپنی اشاعت کے بیسویں برس میں قدم رکھے گا کسی ادبی رسالہ کا کسی بھی طرح آہ و بکا کئے بغیر اور اپنی زبان والوں کی بے حسی کا رونا روئے بغیر دو دہائیوں تک روش عام سے ہٹ کر تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہنا ہمارے خیال میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں۔ دراصل سارا مسئلہ نیت کے کھرے پن اور آپ کے بے لوث ہو کے کمٹیڈ انداز میں تنوع سے بھرپور رسالہ ترتیب دیتے رہنے کا اور اتنے برسوں تک قاری کے لئے اس کو بامعنی بنائے رکھنے کی کامیابی کا ہے۔''

بات صرف نیت تک محدود نہیں تھی وہ سرتا پا کھرے تھے۔ بولتے تھے کہ لب آزاد تھے۔ لکھتے تھے کہ قلم بے باک تھا۔ سوچتے تھے کہ دماغ پر کوئی پہرہ نہ تھا۔ معیار کے معاملہ میں کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہمیشہ ایسی تخلیقات کو لبیک کہا جو نام نہاد ادبی و سیاسی سرماوں کے چہروں سے نقاب ہٹاتی ہیں۔ ذہن جدید کے شمارہ (۶۵) میں وارث علوی کے مضمون کو شامل کرنا زبیر رضوی کے جیسے ہی مدیر کا دل گردہ ہے۔ ہر چند کہ زبیر رضوی کے ہمعصر مدیروں نے شعر وادب، تنقید، تبصرے پر مشتمل ضخیم اور موقر رسالے شائع کئے ہیں جن پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی مگر اُن کی نظر ان صنفوں سے ہٹ کر رقص، سنگیت، ناٹک، ڈرامہ، بت تراشی اور مصوری کی طرف نہیں گئی۔

زبیر رضوی نے ایک بلند اور اعلیٰ مقصد کو ذہن میں رکھ کر رسالہ کی شروعات کی تھی کہ اُردو ادب کو وسعت، تونگری اور عالمی سطحیت عطا ہو۔ رسالہ چند رومانی یا غیر رومانی گھسی پٹی غزلوں، تھکے ہارے افسانوں، تنگ ذہنوں کے بار بار دہرائے گئے مضامین کی غذا نہ بن جائے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے مضمون سے یہ فقرے ملاحظہ ہو، جو شمارہ نمبر (۴۴) کا تجزیہ کرتے ہوئے روز نامہ سیاست حیدرآباد مورخہ ۱۹/اگست ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔

''ہمارے ہاں ادبی جرائد زیادہ تر شاعری (جن میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے) افسانوں، چند ایک تنقیدی مضامین ایک دو ترجموں اور کبھی کبھی سماجی یا سیاسی علوم اور معاشرتی موضوعات پر مضامین وغیرہ کے حامل ہوتے ہیں۔ تھیٹر، مصوری اور فلم وغیرہ پر کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ ایک تو ان موضوعات پر ڈھنگ سے لکھنے والے اُردو میں کم ہیں اور دوسرے یہ کہ ادبی جرائد کے مدیران ان موضوعات کو غالباً اہمیت نہیں دیتے یا اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ لیکن ذہن جدید کے ترتیب کار زبیر رضوی نے ابتدائی شماروں سے ہی ان موضوعات کو اہمیت دی۔''

زبیر رضوی نے ان اصناف پر بھرپور مضامین سے ذہن جدید کو آراستہ کیا۔ زبیر رضوی پہلے مدیر ہیں جنہوں نے اُردو

کے دس ٹاپ ناول کا سروے کرایا تھا۔جس کی گونج نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی سنائی دی تھی۔اس ناول میں سر فہرست عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' کا نام شامل تھا۔عبداللہ حسین نے اپنے ایک انٹرویو میں اس سروے کا ذکر کیا اور اُن کا شکریہ بھی ادا کیا۔

زبیر رضوی کی ہمیشہ کوشش رہی تھی کہ ذہن جدید کا شمارہ پچھلے شماروں سے خوب تر ہو۔جس کی جستجو میں وہ نہ صرف مقامی زبانوں سے کما حقہ وقفیت رکھتے تھے بلکہ عالمی ادب پر اُن کی نظر رہتی تھی۔عالمی سطح پر مقبول ومعروف ایسی شخصیتوں پر ذہن جدید میں متواتر لکھا جن کا تعلق ادب سے ہی نہیں بلکہ مصوری، بت تراشی اور فلم میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔جن میں ایشی شخصیتیں بھی شامل رہیں جو متنازعہ تھیں۔جیسے سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین، نجیب محفوظ وغیرہ۔سلمان رشدی کے بارے میں مَیں کچھ کہنا نہیں چاہتا اُن کے بارے میں مذہب اور ادب سے جڑا ہوا ہر فرد جانتا ہے۔خوشونت سنگھ نے اپنے ایک انٹرویو میں زبیر رضوی کو بتایا تھا کہ شیطانی آیات(the Stanic Vereses) کا اسکرپٹ پڑھ کر یہاں چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔اس کے باوجود پینگوین نے امریکہ اور انگلینڈ میں اس کتاب کو شائع کیا تھا کیونکہ پچاس ہزار پونڈ بطور رائلٹی پیشگی مصنف کو دے چکے تھے۔خوشونت سنگھ کا یہ بھی کہنا تھا کہ اُن کے ناول میں متنازعہ حصہ نہ جوڑا جاتا تو وہ ایک غیر معمولی ناول ہوسکتا تھا۔مجیب محفوظ کے بارے میں زبیر رضوی نے لکھا تھا وہ پہلا عرب کا نوبل انعام یافتہ ادیب ہے۔اپنے ناول Children of Gevelawi کی اشاعت کے بعد متنازعہ شخصیت بن گئی تھی۔۸۲سال کی عمر میں ۱۹۹۶ء میں ایک مذہبی جنونی نے مجیب محفوظ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔اس حملہ میں مجیب محفوظ' محفوظ تو رہا لیکن سیدھا ہاتھ ضائع ہوگیا تھا۔اس کے باوجود مجیب محفوظ نے اپنا لکھنا متواتر جاری رکھا۔

ذہن جدید کے شماروں میں زبیر رضوی نے ایسا شخصیتوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جو غیر متنازعہ تھیں۔جنہوں نے دُنیا کو بہت کچھ دیا تھا۔ٹومس ٹرانسٹر(سودیش شاعر) یاسمینا خضرا(عراقی ناول نگار) ہرٹا مولر(Herta Mueller) رومانیہ کی جرمن نژاد افسانہ نگار اور شاعرہ(نوبل انعام یافتہ) ہلاری منیٹل(ناول نگار نوبل انعام یافتہ)' Chinoa Achebe(نائجریہ ناول نگار) جن جین آسٹن(برطانوی ناول نگار) گنتر گراس(جرمن شاعر وناول نگار) مویان (چینی ناول نگار) سوتیلانہ الیکسی (Svetlana Alexlevich)(سوئٹ یونین نوبل انعام یافتہ صحافی) جون اپ دائیک(Jonpudike)(امریکی ادیب) میں نے یہاں کچھ عالمی شہرت یافتہ ادیبوں اور دانشوروں کے نام گنوائے ہیں ورنہ فہرست اتنی طویل ہے کہ ان سب کا احاطہ کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں۔ذہن جدید کے ہر شمارے میں زبیر رضوی کی کوشش ہوتی کہ عالمی سطح پر ادب، سیاست، فلم اور دیگر زندگی کے شعبوں میں جو اتھل پتھل اور جو سرگرمیاں جاری ہیں ان سے ذہن جدید کے قارئین کو روشناس کرائیں۔قاری اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھیں تاکہ تازہ ہوا کے جھونکوں سے محظوظ ہوسکیں۔زبیر رضوی نے ''بڑی زبان کا زندہ رسالہ'' کا صرف نعرہ ہی نہیں بلند کیا بلکہ عملی طور پر درست ثابت کرنے کی بھرپور سعی کی اور کامیاب بھی رہے۔ایسے مضامین قلم بند کئے جو اُردو زبان کو توانگر بنانے میں اہم رول ادا کرسکیں۔

ذہن جدید کا شمارہ نمبر(۳۲) میں زبیر رضوی نے دی گریٹ عمر کے نام سے ایک ذہن کشا مضمون قلمبند کیا تھا۔دی گریٹ عمر' کی اپنی نایاب جلد سازی کی وجہ سے دُنیا کی مہنگی ترین مجلد کتاب بن گئی تھی۔اس کتاب میں شامل عمر خیام کی

رباعیات' ٹیٹا نک کی غرق ہونے والی قیمتی اشیاء میں دنیا کی سب سے مہنگی کتاب 'دی گریٹ عمر' بھی شامل ہے۔اس کتاب کی جلد سازی پر یاقوت، فیروزہ، نیلم، پکھراج جیسے قیمتی پتھروں کا جڑاو کیا گیا تھا۔ بلاشبہ قارئین اُردو کے لئے یہ حیرت ناک انکشاف ہے۔

پاکستان میں عالمی ادب کے تراجم اوران کے مضامین پر لکھنے والوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو بڑے دھڑلے سے لکھتے ہیں موقر جریدوں کی زینت بنتے ہیں۔اس سلسلہ میں فوری جن رسالوں کے نام میرے ذہن میں آئے وہ یہ ہیں۔ناصر بغدادا کا باد بان' علی محمد فرشی کا سمبل' احسن سلیم (وہ بھی کچھ عرصہ پہلے مرحوم ہو چکے) کا اجراء' اور آصف فرخی کا دُنیازاد۔دُنیا زاد کے سوائے تینوں رسالوں کی اشاعت بند ہوچکی ہے۔زبیر رضوی نے اس روایت کو برقرار رکھا اور عالمی زبان کے تراجم اور مصنف کے بارے میں لکھ کر ذہن جدید کوسنوارتے رہے۔اس سلسلہ میں ذہن جدید کے کئی شمارے مطالعہ کے متقاضی ہیں۔

زبیر رضوی نے ۱۹۶۶ء میں دوردرشن سے وابستگی اختیار کی تھی۔اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے۔اس ملازمت کے دوران انہوں نے کئی نامور ہستیوں کے انٹرویو لیئے تھے جومختلف شعبوں سے جڑے ہوئے تھے۔وہ انٹرویو نشرہونے کے بعد مقبول بھی ہوئے۔زبیر رضوی نے ان تمام انٹرویز کو ذہن جدید کے شمارہ نمبر(۷۰) میں بڑے سلیقے سے ترتیب دیا تھا۔تیکھے سوالات اور سلجھے ہوئے جوابات سے مرصع یہ شمارہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ان انٹرویز میں قرۃ العین حیدر'خوشونت سنگھ' حبیب تنویر' گریش کرناڈ' دلیپ کمار' لتا منگیشکر' امیتابھ بچپن' راہی معصوم رضا' منجیت باوا' استاد بسم اللہ خاں' ذاکر حسین' آر کے لکشمن اور سدھیر تیلنگ کے نام شامل ہیں جن کا ادب، تھیٹر، فلم، مصوری، سنگیت، کارٹون اور رقص سے گہرا رشتہ ہے۔

آزادی کے فوری بعد ۱۹۴۸ء میں زبیر رضوی حیدرآباد آ گئے۔بہت کم عرصہ حیدرآباد میں قیام رہا اس قیام کے دوران مخدوم محی الدین' سلیمان اریب جیسے ترقی پسند شاعروں اور یہاں کے ادبی ماحول سے متاثر ہوئے۔ذہن جدید کی نیو رکھی تو اس کے دوسرے ہی صفحہ پر لکھ دیا تھا مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کی یاد میں۔یہ بات شاید بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگی کہ ذہن جدید کے ابتدائی شمارے روز نامہ سیاست کے دفتر سے قارئین حاصل کرتے تھے۔بعد میں یہ سلسلہ مسدود ہوگیا اور راست ذہن جدید کے قارئین کے گھر کے پتوں پر موصول ہونے لگا تھا۔زبیر رضوی کے حیدرآبادی دوستوں میں خالد قادری، مصطفیٰ اقبال توصیفی، مجتبیٰ حسین، علی ظہیر، نواب محمد عباس انصاری سکندر جیسی شخصیتیں شامل تھیں (علی ظہیر بھی بہت پہلے چل بسے)

میں بہت جونیئر ہوں اور پھر اُن کے حلقے میں بھی شامل نہیں تھا' اس کے باوجود جب بھی اُن کو فون کرتا بہت دیر تک خلوص سے بات کرتے اور اُس وقت تک فون بند نہیں کرتے جب تک میں خود بات چیت کا سلسلہ بند نہیں کرتا۔فون پر اپنے دوستوں کے بارے میں دریافت کرتے یہاں کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کرتے۔جتنی دیر گفتگو ہوتی مجھ کو اپنایت کا احساس ہوتا۔یہ زبیر رضوی کا بڑپن تھا۔میں نے ذہن جدید کے لئے وقتاً فوقتاً چار افسانے روانہ کئے تھے۔دو افسانے شائع ہوئے اور دو افسانے زبیر رضوی نے تفصیلی نوٹ کے ساتھ واپس کردیئے۔ان نوٹس کو پڑھ کر مجھے خود احساس ہوا کہ افسانے میں جھول تھا۔ میں نے دونوں افسانے تلف کردیئے۔بنگلور کے یوسف عارفی کی کہانیاں ہر رسالے میں اہتمام سے شائع ہوجاتی

تھیں۔ایک دفعہ فون پر یوسف عارفی نے مجھ کو بتایا تھا کہ ان کا ایک افسانہ زبیر رضوی کو پسند نہیں آیا تھا۔میرا خیال ہے کہ اُن کا ایسا رویہ ہر لکھنے والے کے ساتھ روا تھا۔معیار کے معاملہ میں کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کیا۔مدیر کو ایسا ہی ہونا چاہیے جو تخلیق کو دیکھے تخلیق کار کو نہیں۔ورنہ یہاں تو ایسے مدیروں کی کمی نہیں جو عہدہ یا اسٹیٹس کو دیکھ کر الٹی سیدھی تخلیقات بھی اپنے رسالے میں شامل کر لیتے ہیں۔

زبیر رضوی کے اخلاق کی ایک اور مثال بیان کرنا چاہوں گا کہ جب بھی اُن کو فون کرتا فون اٹھا لیتے تھے۔فون پر گفتگو کرنے کے لئے کوئی وقت مختص نہیں کیا۔میں ایسے مدیر سے واقف ہوں جنہوں نے چندے کے پیسوں سے کچھ شمارے نکالے اور آسمان پر جا بیٹھا۔فون پر گفتگو کرنے کے لئے وقت مختص کر لیا۔۳ تا ۵ شام۔

زبیر رضوی نے تانیثی ادب کو بڑی اہمیت دی تھی۔اپنے رسالوں کے متعدد شماروں میں خواتین کی تخلیقات شائع کیں۔مقامی خواتین کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بانو قدسیہ، خالدہ حسین، طاہرہ اقبال، زاہدہ حنا اور بیرون ہند کی بیشتر خواتین کی تخلیقات کو بھی شامل کیا۔زبیر رضوی خواتین کو اُن کے حقوق سے محروم دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔خواتین کا اعلیٰ مقام اُن کی نظر میں تھا۔ذہن جدید کے شمارہ نمبر (۶۱) میں لکھا تھا ''کوئی اتفاق کرے یا نہ کریں، صدیوں پہلے راج دربار میں جوّے میں جیتی دروپدی کو بے لباس کرنے کا عمل عورت کی عصمت اور عفت کو دی جانے والی پہلی گالی تھی۔جس کی گونج آج بھی ایک تسلسل کے ساتھ ادب تھیٹر، رقص، مصوری اور لوگ کتھاوں میں سنائی دی جا رہی ہے۔''

زبیر رضوی نے ہر صنف میں عورت کی اہمیت کو سراہا۔رقص کی بات چلی تو ستارہ دیوی کو نہیں بھولا، گیتوں کا ذکر چلا تو لتا منگیشکر اور شمشاد بیگم کو یاد کیا۔ڈرامے کے حوالے سے نادر ظہیر ببر کی صلاحیتوں کو سراہا۔حوالے بہت ہیں، لکھا بہت کچھ جا سکتا ہے۔صرف اتنا عرض ہے کہ زبیر رضوی اُردو داں حضرات کو زندگی کے ہر شعبوں اور ہر اصناف سے وابستہ دیکھنے چاہتے تھے۔شمارہ (۵۶) میں انہوں نے لکھا تھا۔''اُردو دُنیا کی بدقسمتی ہے کہ وہ ابھی تک ایک ایسی اندھی گلی میں سفر کر رہے ہیں جس میں روشن خیالی اور نئے تصورات وزاویہ کے لئے جگہ نہیں۔اسلئے اُردو میں نہ تھیٹر ہو رہا ہے اور نہ ڈرامے اسٹیج ہو رہے ہیں۔''

زبیر رضوی نے کبھی بھی اپنے مستقل قارئین کو خریدار نہیں سرپرست کہا۔یہ اُن کی اعلیٰ ظرفی تھی۔ایک مدیر ہونے کی حیثیت سے زبیر رضوی نے جو سرگرمیاں دکھائیں اُن پر مزید گفتگو کے دروازے کھلے ہیں اقتباسات بھی اتنے دیئے جا سکتے ہیں کہ دفتر کے دفتر کھل جائیں۔حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ زبیر رضوی بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن مدیرانہ صلاحیتوں کا جو مظاہرہ انہوں نے کیا ہے وہ خداداد تھیں۔جو اپنے مزاج اور فطرت کے خلاف جا کر کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے آگے سرخم نہیں کیا تھا ایسے مدیر کو موت نے بھری بزم سے چپ چاپ لے کر چلی گئی۔

OOO

سب رس

میں صرف **غیر مطبوعہ** مضامین اور

تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

شائستہ فاخری

مضمون

تخلیقی زمین کی نئی کیاری

ادب اپنے آغاز سے ہی عشقیہ روایت کا پاسدار رہا ہے۔ یہ محض کسی جذبۂ خیال کا اظہار نہیں، بلکہ تہذیبِ اظہار، تہذیبِ جذبات اور تہذیبِ خیال کا بھی علمبردار ہے۔ عشق قدرت کا پسندیدہ کھیل، نسان کی کمزوری رہا اور ادب کا اہم موضوع رہا ہے۔ یہ ناول

''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' ایک طویل عشقیہ داستان ہے، جو الگ الگ کہانیوں کے مختلف کرداروں کے ذریعے ثقافتی اور معاشرتی قدروں اور انسانی تہذیب کے اُتار چڑھاؤ کی جھلکیاں بھی پیش کرتا ہے۔

ادب کی اپنی تخلیقی دنیا ہوتی ہے اور ہر دنیا کی اپنی زمین ہوتی ہے، اور ہر زمین کی اپنی خوبی اور خامی بھی ہوتی ہے۔ زمین کی تخلیقیت اُس کی کاشت کاری میں ہوتی ہے۔ کچھ ایسی زمینیں ہوتی ہیں جہاں فرٹی لیٹی (Fartility) زیادہ ہوتی ہے اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں بنجر زمین کہتے ہیں۔ یہ قلم کار کے فکری معیار پر منحصر ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے بیج کس زمین پر بوتا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیت سے اُسے کتنا پروان چڑھاتا ہے۔ فکشن رائٹنگ میں بالخصوص ناول نگاری کے فن میں تخلیقیت کا یہ پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں آسمان کی وسعت اور سمندر کی گہرائی سمائی جاسکتی ہے۔ اس گہرائی اور وسعت کی حد قلم کار کی اپنی سوچ اور صلاحیتوں کی بنیاد پر منحصر ہے۔

مشہور فکشن رائٹر نورالحسنین صاحب کا یہ ناول'' چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' جس کی زمین عشقیہ ہے۔ اپنے آپ میں ایک نیا تخلیقی تجربہ ہے۔ عشق کی مٹی کی یہ تاثیر ہوتی ہے کہ اس میں تشنگی اور نامکمل ہونے کا احساس قائم رہتا ہے۔ عشقیہ داستانیں ہمیشہ نامکمل رہی ہیں، اور جو مکمل ہوگئیں، اُنھوں نے اپنی وسعت کو دائروں کی حد میں سمیٹ لیا۔

عشقیہ داستانیں ہر زبان وادب کا حصہ رہی ہیں اور اُن تمام کہانیوں اور کرداروں کو سمیٹ کر ایک پلیٹ فارم پر لانا اور فکشن کے دھاگے میں پرو کر ناول کی شکل دینا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ جسے قلم کار نے بخوبی نبھایا۔ ناول کی شروعات ہوتی ہے عشق کی ہم کلامی سے، کیونکہ پورے ناول میں عشق اور چاند کو کردار بنا کر، اُس کے ذریعہ مختلف عشقیہ کہانیوں کو آگے بڑھانے اور اُس کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> '' میں عشق ہوں، میں اپنے خالق کا کرشمہ ہوں، جنون میرا مزاج، وفا اگر میری سلطنت ہے تو سرکشی اور بغاوت میری صفت، میں ازل سے ہوں اور ابد تک باقی رہوں گا ۔۔۔۔۔۔میں عشق ہوں، میں جنون ہوں، میں بے اختیار ہوں، میں لازوال ہوں، میں ہر پابندی کے خلاف ہوں، میں ذات پات، جماعت سے بہت بلند ہوں، میں ہر جگہ موجود ہوں، زمانہ میری گذرگاہ ہے، میں ہر عہد میں سانسیں لیتا ہوں، میرے بے شمار چہرے ہیں، اور میرے ہر چہرے کا راز دار چاند ہے۔ اُس نے چاند کی طرف دیکھا، '' اے چاند۔۔۔! کیا تو میرے ہر سفر کی گواہی دے سکتا ہے؟؟؟

چاند نے آنکھیں کھولیں، اور زمین کی طرف
دیکھنے لگا۔
وقت کا چاک اُلٹا گھومنے لگا۔
رات دن میں اور دن رات میں تبدیل ہونے
لگے۔
فضائیں معطر ہونے لگیں۔
صدیاں ماضی کی طرف لوٹنے لگیں۔''

یہی وہ پہلا زینہ ہے جس پر کھڑے ہوکر تخلیق کار نے عشقیہ داستانوں کا وہ لمبا چوڑا تخلیقی پلیٹ فارم تیار کیا جو پورے ناول کا نہ صرف احاطہ کرتا ہے بلکہ صدیوں کا سفر طئے کرتے ہوئے آج کی نئی صدی میں داخل ہوتا ہے۔

چاندنی رات ہے۔ چاند کے گھیرے میں دادی گم صم بیٹھی ہے۔اور باتیں کرنے والا چاند نئی نئی کہانیاں جیسے خود سنا رہا ہو ،عشق سے عشق کی باتیں، دو کردار اور کہانیوں کے سلسلے وار کڑیاں، یہ دو کردار ہیں، عشق اور چاند۔

چاند اپنے آپ میں علامت ہے رومانیت کی ، اور جب چاند باتیں کرے گا تو وہی کرے گا جو اُس کے خمیر کی تاثیر میں پنہاں ہے۔ عشق کے بغیر دنیا سونی ہے۔زندگی ویران ہے۔اگر عشق نہ ہو تو نماز یوگا بن جاتی ہے، اور اگر عشق شامل ہے تو نماز عبادت کے زینے طئے کرتے ہوئے بلندی کی جانب اُٹھنے لگتی ہے ۔بات زمین سے اُٹھ کر آسمان کی ہونے لگتی ہے۔عشق کے مرتبے بلند اور بلند ہونے لگتے ہیں۔عشق کی کہانی عشق کی زبانی کچھ اس طرح پیش کی گئی ہے :

''میرا پہلا جلوہ کائنات کی تخلیق کا بہانہ ہے۔
اُس کی حمد و ثنا میں غرق ملائکہ میری ہی ڈوری
میں بندھے ہوئے ہیں۔وہ آسمان سے زمین
پر مجھے بھیجنا چاہتا تھا، اُسی نے مجھے آدم اور حوّا
کی آنکھوں میں روشن کیا اور پھر اُن کے ساتھ
ہی مجھے بھی زمین پر اُتار دیا۔۔۔''

اس ناول کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ تخلیق کار نے کردار کے لحاظ سے عہد اور عہد کے حساب سے نہ صرف وہاں کی مخصوص ثقافتی قدروں کو اُجاگر کیا ہے بلکہ اُس معاشرے کی زبان، لب ولہجہ اور جغرافیائی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔عرب کی سر زمین کا یہ منظر اپنی داد وصول کرتا ہے :

'' سورج آگ اُگل رہا تھا۔گرم لو چل رہی
تھی۔سوقِ بصرہ کے دروازے پر ایک جمِ غفیر
تھا، ہر شخص اندر جانے کے لیے بے چین تھا۔
عرب سردار اونٹوں پر سوار چلے آرہے تھے۔
اُن کے سفید براق لباس اور سروں پر اونٹوں
کے بالوں سے لپٹی ہوئی رسیاں ، جن کے
سنہرے دھاگے دھوپ میں چمک رہے تھے۔
سیاہ لبادوں میں نقاب پوش خواتین اپنے
غلاموں کی حفاظت میں ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں
۔دھوپ کی شدت کے باعث کیا انسان اور کیا
جانور دونوں ہی پریشان تھے۔اور بازار کے
میدان میں مختلف سائبانوں میں ہر قسم کی
دکانیں لگی تھیں ، اور اُن کے دکاندار بلند
آوازوں سے گاہکوں کو متوجہ کر رہے تھے۔
تعال یا حبیبی ، تعال یا حبیبی۔۔۔فدل فدل
۔۔مہدی ابنِ سعاد کی نظریں جنوب کی طرف
اُٹھیں ، ایک بڑا سائبان جسے اونٹوں کی
کھالوں سے پوری طرح ڈھک دیا گیا تھا۔

باہر پہریدار ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے اور
حبشی غلام نیلامی سے پہلے پانی کا چھڑکاؤ کر
رہے تھے۔''

اس ناول میں تخلیق کار نے نثری نظموں کے کئی گل بوٹے بھی سجائے ہیں ۔نظمیں علمی و تہذیبی زندگی میں بھی ایک حرکت اور گرمی پیدا کرتی نظر آتی ہیں ۔ معانی، اسلوب اور ہئیت شاعری کے بنیادی ارکان ہیں ۔ممکن ہے یہ نظمیں معیار کی وہ بلندی چھوتی نظر نہ آئیں جس کی اُمید عام طور پر معیاری شاعری سے لگائی جاتی ہے ۔مگر اس میں دو رائے نہیں کہ ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' ناول کی ہر نظم ناول کے عشقیہ زمین کو فروغ دیتی نظر آتی ہیں ۔اور قاری خود کو کردار سے جڑا ہوا پاتا ہے ۔مثلاً

'' اِک کومل روپ وتی، نینوں کے بن میں
اِٹھلائے لجائے
مٹکے، شنگھار دکھائے
نگن جوبن کے اُبھار
وِلاسا کے بان چلائے
کالی لٹیں، بن کے ساون کی گھٹا
رِم جھم من کو اُکسائیں
تو پھر کیوں نہ اِچھاؤں کا پربت
بن کے جوالا مکھی
آپ ہی آپ اگن برسائے
یہ بھی ملاحظہ فرمائیں
'' جو عشق کی آنکھ نہیں رکھتے
جو جمالِ یار سے نابلد ہیں
اُن کی آنکھیں بھی کیا آنکھیں ہیں
اُن کی باتیں بھی کیا باتیں ہیں
تم میری سنو!
میں منزلِ عشق کا مسافر ہوں
میں اپنے عشق میں صادق ہوں۔

خوبصورت بیانیہ اور بہترین مکالمے اس ناول کی ایک اور خوبی ہے ۔ جو قاری سے بھرپور داد وصول کرتی ہے ۔مکالمے نہ صرف کردار کی ضرورت ہیں بلکہ داستانوں کو داستانوی رنگ سے جدا کر کے حال سے جوڑتے ہیں ۔ یہ مکالمے برجستہ اور بے باک ہیں ۔سکندر اعظم اور رخسانہ کی پہلی ملاقات کے یہ مکالمے ملاحظہ فرمالیں

''حسینہ نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پالیا اور اُس سے دو قدم آگے بڑھ گئی اور پھر اُس کی زبان آگ اُگلنے لگی،'' شہنشاہ کیا پتھر پگھل گیا ،کیا فولاد نرم ہو گیا؟ کیا زمین تنگ ہو گئی؟ کیا سکندر اعظم کی فتوحات کی تاریخ مکمل ہو گئی ہے جو وہ حُسن کی بارگاہ کے دروازے کو کھٹکھٹانے پر مجبور ہو گیا ہے؟''

سکندر نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مقابل کر لیا اور پھر نہایت رومانی لہجے میں گویا ہوا،'' نہ پتھر پگھلا، نہ فولاد موم ہوا، نہ زمین تنگ ہوئی، نہ سکندر اعظم کی فتوحات کی تاریخ مکمل ہوئی ۔'' اُس نے حسینہ کو کچھ اور اپنے سے قریب کیا ، اور پھر نہایت سحر انگیز لہجے میں مخاطب ہوا،'' لیکن سکندر انسان بھی تو ہے ۔ اُس کے سینے میں بھی دل ہے۔''

''دل۔۔۔؟'' حسینہ کے چہرے پر پھر ایک بار طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی،'' شہنشاہ اگر

آپ کے سینے میں دل ہوتا تو آپ کو اُن محبوباؤں کی آہیں بھی سنائی دیتیں جن کے عاشقوں کو آپ کے ذوقِ شہنشاہیت نے قتل کردیا۔'' اُس کی آنکھوں میں آنسو رولنے لگے،''اُن یتیم بچوں کی دلخراش چیخیں بھی سنائی دیتیں۔'' اُس کی آواز کانپنے لگی،''اُن ماؤں کی تڑپ بھی آپ کی نظروں میں آتی، جن کے پہاڑ جیسے بیٹوں کو آپ نے محض اس لیے تہہ تیغ کردیا کہ آپ کی بہادری کی دھاک سارے عالم میں پھیل جائے ، اُن لُٹے ہوئے بادشاہوں کے ارمان اور آرزوؤں کو بھی آپ محسوس کرتے جو عرش سے زمین میں پہنچ گئے۔

''وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

سکندر بھی اُس کے برابر بیٹھ گیا اور اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا،''میں نے وہ سب کچھ سنا، میں لرزیدہ بھی ہوا، پچھتایا بھی۔

''وہ اُس کے پاس سے اُٹھ گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا،''لیکن میرے اُستاد نے مجھ سے کہا تھا ، ادھورے اور نامکمل لوگ زمین پر بوجھ ہوتے ہیں۔ اُنھیں مٹا دینا چاہیے تاکہ یہ دنیا مکمل زندگی کا صحیح لطف اُٹھا سکے۔۔۔تم سن رہی ہو حسینہ۔۔۔؟''

''جی۔میرا نام رخسانہ ہے۔''

تشبیہ اور استعارہ ادب کے تخلیقی فن پارے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اُن کا پہلا تاثر 'معنی آفرینی' ہے دوسرا 'حُسن آفرینی' اور تیسرا تاثر جو بے حد اہم ہے۔ وہ ہے تخلیق میں اختصار اور بلاغت پیدا کرنا۔کبھی کبھی تخلیق کار ایک ہی سی تشبیہ سے کرداروں کے موڈ کے مطابق دو الگ الگ تاثر بھی پیدا کرتے ہیں۔مثلاً لیلیٰ کی آمد پر چاند قیس کو ریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتا ہے،'' دیکھو تمہاری لیلیٰ کے لیے میں نے زمین پر سارے ہی تارے اُتار دیئے ہیں۔'' (ص۔۱۹۰)

چاندنی سے روشن ریت کے ان ذروں کو قیس بھی اپنی مسرتوں میں سمیٹتے ہوئے لیلیٰ سے کہتا ہے،'' دیکھو تڑپ آہ بنی، آہ خواب میں ڈھلی، اور خواب حقیقت بن گیا، تمہاری آمد سے یہ صحرہ گلستان بن گیا۔چاندنی میں چمکتے ہوئے یہ ذرے تمھیں خوش آمدید کہہ رہے ہیں''۔(ص۔۱۹۴)

اب یہاں دیکھیے، منظر وہی ہے۔ ریت کے ذرے چمک رہے ہیں، لیکن لیلیٰ کا بھائی غصے سے بھرا ہوا، اُس کی تلاش میں صحرا میں پہنچتا ہے، اور تخلیق کار ان ہی ریت کے روشن ذروں کو اُس کے جلال کی زبان بنا دیتا ہے،'' چاندنی رات میں ریت کے ذرے انگاروں کی مانند دہک رہے تھے۔'' (ص۔۲۱۱) یہی فن کاری ہے۔

ناول ماضی بعید کی بہت ساری داستانوں سے گزرتا ہوا ماضی قریب کی داستانوں تک پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے:

> '' عشق جب تک دل کی وادیوں کا راہی رہا، جنون اُس کی کیفیت رہی، لیکن جب اسی عشق نے ہوش کی اُنگلی تھامی تو کسی زین آبادی کی چوکھٹ سے کوئی عالمگیر مذہبی لبادہ اوڑھ کر نکل گیا۔میرؔ کا عشق دن کے اُجالے میں گُم ہوگیا ،تو غالبؔ کے قدموں میں کوئی غزل سرا تو ہوئی لیکن دامنِ دل تک نہ پہنچ سکی، داغؔ منّی بائی حجاب تک پہنچنے کا راستہ طئے نہ کر سکے، اور

بٹوٹ کی وادیوں سے سعادت حسن منٹو یادیں
ہی اُٹھا کر لائے، تو پھر ولی دکنی کے شہر خجستہ
بنیاد اورنگ آباد میں یہ کون ہے جو دل کے
زخموں کو ہتھیلی پر سجائے گلی گلی بھٹک رہا ہے؟''

وہ بھٹکتا رہ گیا اور محبوب پر محسن کو فوقیت مل گئی۔ ناول اکیسویں صدی کی دہلیز میں داخل ہوتا ہے، لیکن اب تو سب کچھ بدل گیا ہے:

'' زمانے نے کروٹ بدلی، قدریں بدلیں، ضروریات اور نئے رجحانات نے لڑکوں اور لڑکیوں کو مخلوط پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ بیسویں صدی گود سے اکیسویں صدی میں پہنچتے پہنچتے تکنالوجی نے دنیا کو سمیٹ کر ایک گلوبل ولیج بنا دیا۔ سات پردوں میں چھپے ہوئے بدن کے سارے اسرار اب صرف ایک کلک کے محتاج ہوگئے۔ آسانیوں نے قربتوں کی کشش اور آنکھوں کی مقناطیسی قوتوں کو زائل کر دیا۔ عشق کی آگ جس میں کبھی تن من سب کچھ جل جاتا تھا، اب محض چاہت میں تبدیل ہوگئی اور چاہت نے خواہش کا لبادہ اوڑھ لیا، اور خواہش نے ہوس کا راستہ اختیار کیا، تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی کے احساس نے جنم لیا۔ اب آہیں بھرنے کا دور ختم ہو گیا، جنگلوں اور صحراؤں میں بھٹکنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ اب اُن کی جگہ ہوٹلوں، پارکوں اور تفریح گاہوں نے لے لی، اور ایک نیا معاشرہ سامنے آیا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ زندگی کے ساز پر محبت کے نغمے نہیں گونجتے، گونجتے ہیں لیکن نئے ماحول کی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ۔۔۔''

یعنی چاند اب بھی باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن زمانے کی مصروفیت نے انسان کے پاس کہاں وقت چھوڑا ہے۔ بہرحال یہ ایک عمدہ ناول ہے۔ ایک ایسا ناول جو اپنے اندر بھرپور مطالعاتی وصف رکھتا ہے، یہ کسی موسم کا پابند نہیں ہے بلکہ ہر موسم اس کے لیے ہے۔ پھر بھی یہ بات کہتے ہوئے کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ اس میں شامل داستانوں کے کرداروں میں چاہت تو موجود ہے لیکن اُس تڑپ کی کمی ہے جو دار تک پہنچاتی ہے، وہ بے چینی دکھائی نہیں دیتی جو وصل کی خاطر آگ کا دریا پار کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ اس کے باجود یہ نورالحسنین نے ایک ایسی کوشش ہے جسے قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جائے گا، اسے اُردو ناولوں میں ایک اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے اور اسے قاری کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

OOO

نورالحسنین کا نیا ناول

''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے''

عرشیہ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

زبیر عالم

مضمون

''بیگ احساس کی افسانہ نگاری: دخمہ کی روشنی میں''

بیگ احساس کے افسانوی سفر کی چوتھی دہائی مکمل ہوچکی ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ بعنوان ''خوشۂ گندم''۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔تب سے لے کر اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔اس درمیان ان کے متنوع رنگ و آہنگ کے افسانے نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے بلکہ فارم میں خوشگوار تجربے کے ساتھ قارئین کی توجہ کا مرکز بنے۔بیگ احساس کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ایک طویل عرصے تک درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہنے کے بعد موصوف اب سبکدوشی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔

ہمارے یہاں کے افسانوی رجحان کو پیش نظر رکھیں تو پہلا سوال یہ ہوگا کہ بیگ احساس کو کس رجحان کا پابند کیا جائے؟ کیا وہ کسی انداز خاص یا نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں جن کی وساطت سے انہیں کسی ایک خاص زمرے میں جگہ دی جائے؟ ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں یہی طریقہ مقبول عام ہے۔اس طرز انتخاب میں جملہ فضائل موجود ہوں یا مفقود،نقصان بہرصورت تخلیق کار کے حصے میں میں آتا ہے۔ناقدین اپنے تحفظات کے ساتھ تخلیق کار کے ساتھ ہوتے ہیں۔بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ہونا یہی چاہیے،مگر ایسا ہے نہیں۔کیونکہ ایسے ہر مطالعہ میں تنقید نگار کا soft corner تخلیق کار کے تخلیقی منظرنامے پر چھا جاتا ہے اور قارئین اس صورت سے دوچار ہوتے ہیں کہ وہ تخلیق کار کو دیکھیں کہاں سے؟ ناقد اپنے آپ کو تخلیق کار سے پرے کیوں کرے؟ حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے یہاں ابتدائی دور سے ہی اس چلن نے جڑ پکڑ لی ہے کہ ہم تخلیق کار کو اس کے متن کے حوالے سے نہ دیکھ کر تنقید نگار کی انگلی کے سہارے تخلیق کار کے در دولت تک پہنچتے ہیں۔ہم نے اپنے بڑوں سے ہی یہ جانا ہے کہ جب ہم انگلی کا سہارا لیتے ہیں تو سہارا دینے والا دانستہ طور پر راستے کے بہت سے منظر سے آنکھیں چار کرنے نہیں دیتا۔اس کے اس عمل کے پس پشت دو دو چار والی منطق کارفرما ہوتی ہے۔اردو کے حوالے سے یہ صورت حال خاصی پریشان کن ہے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم افسانہ نگاروں کی فہرست سازی کرتے وقت ان کے تمام سرمایے پر گہری نظر ڈالتے اور پھر اس کی روشنی میں خامہ فرسائی کرتے مگر ہم نے ایسا نہ کرکے صرف یہ دیکھا کہ اس کے یہاں ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق کہانی میں معاملات و مسائل بیان ہوئے ہیں یا نہیں اور اسی کی بنا پر ہم نے انہیں یا تو اپنی فہرست کا حصہ بنایا یا خارج فہرست کیا۔

ایسا متعدد بار ہوا ہے کہ تخلیق کاروں نے اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں گفتگو کرتے وقت کسی رجحان سے اثر قبول کرنے کا اقرار کیا ہے مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ اس نے کسی خاص نقطۂ نظر کی بنیاد پر تخلیقی کارنامہ انجام دینے کی ہامی بھری ہو۔تخلیق کار دوران تخلیق ہر قسم کے جبر سے آزاد ہوتا ہے۔اس کی تخلیق کسی خاص طرز سے اثر انگیزی کا ثبوت فراہم کرتی ہے مگر ایسا شعوری طور پر نہیں ہوتا ہے۔مثال کے طور پر میں ابھی بیگ احساس کا افسانہ ''دخمہ'' پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں کہ یہ افسانہ پہلی بار کب شائع ہوا۔

اس افسانہ کے شائع ہونے کا صحیح وقت معلوم ہوتا تو اس بات کے تعین میں بڑی آسانی ہوتی کہ بیگ احساس صاحب جدید افسانہ لکھ رہے ہیں یا مابعد جدید طرز کا افسانہ لکھ رہے ہیں۔جیسے ہی یہ مرحلہ طے پاتا میں اس بات کے لیے کوشاں ہوجاتا کہ جدید افسانہ ہے تو تنہائی ،رشتوں کا انہدام اور وجودی

سروکاروں سے علاقہ رکھنے والے گوشوں کی طرف رخ کروں اور ان کی مدد سے افسانہ نگار کو خالص جدید افسانہ نگار ثابت کروں۔ دوسری صورت میں یہ ہوگا کہ بیگ صاحب مابعد جدید افسانہ لکھ رہے ہیں تو یہ دیکھا جائے کہ ان کی اس تخلیق میں کہانی پن کا خوشگوار احساس ہے کہ نہیں، مقامی کلچر تخلیق کے پردے سے اپنی موجودگی درج کرا رہا ہے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ پیش کردہ دونوں صورتوں میں تخلیق پس پشت ہے اور ادبی تھیوری پیش پیش۔ ظاہر ہے کہ اس طرز پر مبنی کوئی بھی مطالعہ فن کو صرف ثانوی حیثیت فراہم کرسکتا ہے اول نہیں۔

ہم آپ ترقی پسندوں کو پانی پی پی کر اس بات کے لیے کوستے رہے ہیں کہ ان کے یہاں ایک طرح کا جبر ہے۔ وہ ایک خاص قسم کا ادب تخلیق کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کیا سطور بالا میں اس قسم کا جبر نظر نہیں آتا۔ واقعہ یہ ہے کہ تخلیق کار ہمیشہ ہر قسم کے خارجی دباؤ سے آزاد ہو کر تخلیقی کارنامہ انجام دیتا ہے۔ یہ ہماری پریشانی ہے کہ ہم اس کے تخلیقی عمل کے برابر جا کر معاملہ نہیں کرتے اور کسی تنقید نگار یا کسی خاص تنقیدی نقطۂ نظر کے وسیلے سے تخلیق کار تک پہنچتے ہیں نتیجاً تخلیق کیا کہہ رہی ہے اس کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا، ہم صرف یہ دیکھنے میں رہ جاتے ہیں کہ تخلیق کار ہمارے مطابق کیا کہہ رہا ہے۔ پروفیسر طارق چھتاری نے شاید اسی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مابعد جدید تھیوری یوں تو ادب کو پرکھنے، جانچنے اور accept کرنے کے رویوں پر مبنی ہے مگر جب ادب کو accept کرنے کے رویے بدلتے ہیں تو ادب تخلیق کرنے کے طریقے خود بخود بدلنے لگتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ طریقے نئے تنقیدی اصولوں کے اثر سے نہیں بدلتے بلکہ ادب کو accept کرنے جو عمومی رویہ نمو پا رہا ہوتا ہے اس کا اثر سب سے پہلے تخلیق کار قبول کرتا ہے۔ لہٰذا تخلیقی لمحات کے دوران خود مصنف کے اندر بھی ادب کو پرکھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور یہی سلسلہ ادب میں ایک نئے طرز کی داغ بیل ڈالتا ہے''۔ [1]

طارق چھتاری صاحب کی اس آرا کو اس لیے بھی خاص کہا جا سکتا ہے کہ موصوف خود ایک تخلیق کار ہیں اور ادب کے بدلتے منظر نامے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی گفتگو مابعد جدید تھیوری کے تناظر میں ہے مگر اس کی صداقت سے انکار مشکل ہے۔ موصوف کے اس اقتباس کی روشنی میں یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فن کار تخلیق کے عمل میں مکمل طور پر اپنے تخلیقی شعور کے زیر اثر ہوتا ہے۔ آیئے اب بیگ احساس کی کہانی ''دخمہ'' کا رخ کرتے ہیں۔

کہانی کا آغاز فلیش بیک میں ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہانی ایک احساس زیاں کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ یہ احساس زیاں کس متاع عزیز کے کھونے پر ہے اس کی تفصیل کہانی کے ارتقائی سفر کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ آغاز کے منظر نامے کو دیکھیں تو ایک طرح کا خاموش ماحول تخلیق کیا گیا ہے۔ نہ تو کرشن چندر کی طرح مناظر فطرت کی وساطت سے مافی الضمیر کی طرف آنے کا رنگ ہے نہ ہی جدیدیوں کی طرح لاتعلقی کے احساس کو جواز فراہم کرنے والے ماحول کی عکاسی ہے بلکہ ایک طرح کا ایسا ماحول تخلیق کیا گیا ہے جو ایک خاص قسم کے احساس کو شدید کرتا ہے۔ ابتدا میں ہی ایک مردہ جسم کا بیان احساس زیاں کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔ ایک غیر شخص کے مردہ جسم کے وسیلے سے واحد متکلم اپنے عزیزوں کے کھونے کا احساس درج کراتا ہے۔ پھر یادوں کے جھروکے سے ان آفاقی صداقتوں کی طرف آتا ہے جن کا تعلق ہمیشہ سے ہماری زمین سے رہا ہے۔ جس کے تحت بزرگ اپنے خردوں کو زندگی کے سفید وسیاہ سے آشنا کرانے کے لیے مختلف مواقع سے حسب ضرورت کچھ کہنے کی گنجائش پیدا کر لیتے ہیں۔ پارسیوں کی طرز زندگی اور اس کے مقابل میں مسلمانوں کی

طرز زندگی کا بیان اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ بہ جز رہن سہن میں فرق کے علاوہ اور کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔اس جزوی حد بندی کے باوجود بچے ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد تھے۔

کہانی کا مرکز پہلے سہراب کا لاشہ تھا۔فلیش بیک سے واپسی کے بعد کہانی کار بتاتا ہے کہ سہراب ایک پارسی شخص ہے۔اس کی دکان قدیم شہر کے مرکزی مقام پر ہے۔اس بات کی کہیں وضاحت نہیں ہے کہ کہانی کس جغرافیائی خطے کا احاطہ کرتی ہے لیکن اشارے اتنے واضح ہیں کہ قاری جان جاتا ہے کہ یہ قدیم حیدرآباد شہر ہے۔سہراب نامی شخص کی دکان ''مے کدہ'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔سہراب کے اجداد نے اس کو قائم کیا تھا اور اب یہ سہراب کے حوالے ہے۔''مے کدہ'' کی وجہ تسمیہ پر غور کریں تو یہ وہ مرکز خلائق ہے جہاں تفریق مذہب وملت کا سایا بھی نہیں گزرتا۔منظر کی نیرنگی ملاحظہ ہو:

''سہراب کا 'مے کدہ' شہر کے مصروف علاقے میں تھا ۔ممکن ہے جس وقت اس کے اجداد نے ''مئے خانہ'' کھولا ہوگا یہ مصروف ترین علاقہ نہ رہا ہو۔کیونکہ سامنے راجہ صاحب کی بہت بڑی دیوڑھی تھی ۔۔۔۔بغل میں بھی ایک بہت بڑی دیوڑھی تھی۔۔۔۔دائیں جانب میں ڈرامہ تھیٹر تھا۔اور بائیں جانب بہت آگے انگریزوں کی ریزیڈینسی تھی۔مقابل میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی مسجد سے لگ کر جو گلی تھی وہ ''مجردگاہ'' تک جاتی تھی۔مجردگاہ ادیبوں،شاعروں اور فن کاروں کا میٹنگ پوائنٹ تھا۔اس میں فائن آرٹس اکیڈمی بھی تھی اور رسالے کا دفتر بھی۔'' [۲]

''مے کدہ'' شہر کا سب سے قدیم شراب خانہ تھا اور اس کی پیشانی پر سن تعمیر ۱۹۰۴ء کندہ ہے۔سطور بالا میں درج تفصیلات کو پیش نگاہ رکھیں تو ''مے کدہ'' کے تعمیر کے عرصے اور اس کے بند ہونے کے درمیان کا عرصہ بہ مشکل نصف صدی سے کچھ زائد کا ہوگا۔اب کہانی کار کے بیان کی طرف آتے ہیں۔پارسیوں کی حیدرآباد میں آمد سالار جنگ کی دعوت پر ہوئی تھی۔نواب حیدرآباد نے انہیں انتظامیہ کا رکن بنایا۔ان کی عبادت گاہوں کو سرکاری خزانے سے امداد ملی۔سرزمین حیدرآباد ان افراد کے حق میں جنت ارضی ثابت ہوئی۔فلم سازی کی صنعت ابتدا سے ہی پارسی لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔اس کہانی میں سہراب کی زبان سے ہم سنتے ہیں کہ دور قدیم میں حیدرآباد کے سنیما گھروں کا عالم یہ تھا کہ فلم کے درمیان ایک سلائڈ کے ذریعہ بتایا جاتا تھا کہ ''وقفہ برائے نماز''۔ناظرین بعد نماز فلم کے باقی ماندہ حصے کو دیکھتے تھے۔

جس معاشرے میں رواداری اس سطح پر ہو ایسے معاشرے کا اب صرف تصور کیا جاسکتا ہے۔کہانی کی بہت سی تفصیل کی طرف اشارے یا کچھ کہہ کر دیگر تفصیل کو کو معرض التوا میں رکھنا اور کہانی کے دوسرے حصے پر توجہ صرف کرنا قاری کو تادیر کہانی سے باندھے رکھتا ہے۔یہ فنی حربہ اگر ماہر کہانی کار کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو اپنے امکانات کے آخری مقام تک رسائی پاتا ہے۔بیگ احساس کی اس کہانی میں یہ فنی حربہ اپنی آخری سرحدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔سہراب کی موت کے منظر نامے کو ابتدا میں لا کر تخلیق کار ماحول کو رنجیدہ تو کرتا ہے لیکن یہ اثر دیر تک قائم نہیں رہتا کہ وہ دوسرے امور پر توجہ صرف کرنے لگتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ کہانی کار کے پیش نظر سہراب ایک وسیلہ ہے کسی اور مقصد کو پا لینے کا۔

حیدرآباد شہر اور اس سے وابستہ تہذیب وتمدن کے شیرازے کا بکھرنا پھر اس کے بعد آزادئ وطن کے ساتھ ہی زبانوں کی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل، نئے حکمرانوں کی جانب سے مسلسل شہر کی قدیم صورت کو مجروح کرنا اور نئی ہواؤں کے ساتھ شہر کے در ودیوار میں نفرت کا سرایت کر جانا جس کے نتیجے میں شہر کی قدیم تہذیب وتمدن کا رخصت ہو جانا یہ سب کہانی کے پردے پر تواتر کے ساتھ ابھرتے ہیں۔سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس قسم کے بیانات سے کیا تاثر قائم کیا جائے۔کیا یہ کہا جائے کہ بیگ احساس نے

بنیادی طور پر احساس زیاں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔اب یہ تہذیب وتمدن کے رخصت ہونے کا زیاں ہو، پولیس ایکشن کی صورت میں مسلمانوں کے وقار کا زیاں ہو، قدیم تہذیب وتمدن کے سرپرستوں کے غیر ملک ہجرت کر جانے کا زیاں ہو، فساد کے سبب لوگوں کے آپسی اعتماد کے جانے کا زیاں ہو یا حکومت کے ذریعہ تاریخی حیثیت سے انکار کی صورت میں انتہائی اہمیت کے حامل قدیم شہر کی آرائش وزیبائش سے ہاتھ اٹھا لینے کا زیاں ہو۔یہ تمام آپس میں مربوط ہوکر احساس زیاں کو نمایاں تر کرتے ہیں۔

اس شہر خراب کے معمول پر آنے کی ایک ہی صورت ہے کہ پھر فرش پر چینی گرا دی جائے اور دیکھا جائے کہ چیونٹیاں ادھر کا رخ کرتی ہیں یا نہیں۔افسانہ نگار کا رجائی انداز بتاتا ہے کہ ہم اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ چیونٹیاں ضرور آئیں گی۔کہانی کے بزرگ کردار کے بقول امن و آشتی کا صرف ایک یہی ذریعہ ہے۔اسی طرح سہراب کے لاشے کو کھانے کے لیے بیس برس کے بعد گدھوں کا شہر کا رخ کرنا بھی اسی رجائی انداز کی ترجمانی ہے۔کہانی کا اختتام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ رواداری پھر سے آجائے تو یقینی طور پر معاشرے کا بگاڑ ختم ہوجائے اور ایک بہتر معاشرے کی تشکیل نو کا عمل اپنے انجام کو پہنچے۔ظاہر ہے کہ رواداری ہی وہ متاع بیش بہا ہے جس کی غیر موجودگی نے اتنا بڑا بکھیڑا کھڑا کیا ہے۔یہ بات خاطر نشاں رہے کہ رواداری کے مفقود ہونے کا سلسلہ کسی ایک خاص طبقے سے وابستہ نہیں ہے کہانی کے تمام افراد اس کی کمی سے دوچار ہیں۔ورنہ کیا وجہ ہے کہ وہی معاشرہ جو کل تک مے کدے کے مقابل مسجد کے ہونے پر معترض نہیں تھا آج اسی مسجد کو بنیاد بنا کر مے کدے کو بند کرا کر دم لیتا ہے اسی طرح سہراب تاحیات اس لیے شادی نہیں کرتا کیونکہ اسے کوئی پارسی لڑکی نہیں ملی یہ جانتے ہوئے بھی کہ شہر میں اس کے ہم مذہبوں کی تعداد مسلسل کم ہوتی جارہی ہے۔حاصل گفتگو یہ ہے کہ کہانی کا بنیادی معاملہ احساس زیاں ہے۔اس کے مختلف shades کو نمایاں کر کے افسانہ نگار نے اس بنیادی معاملے کو کبھی وضاحت سے، کبھی موازنے سے اور کبھی تاریخی حوالوں کی مدد سے نمایاں تر کرنے کی کوشش کی ہے۔

کہانی کو ابتدا میں جن خطوط پر رواں کیا گیا ہے اگر نا پختہ کار تخلیق کار ہوتا تو شاید کسی ایک فریق کو تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیتا اور کہانی کو مکمل طور پر اس کے مخالف ہوکر انجام تک پہنچاتا۔یہ کہانی بیگ احساس کی فنی گرفت کا عمدہ نمونہ ہے۔وہ کہانی میں کسی کی جانب داری کے بغیر موجود ہیں اور کرداروں کو ان کے فطرت کے مطابق زمین فراہم کی ہے۔وہ قوموں کے تدریجی سفر میں نشیب وفراز کی منزلوں کا پتہ بھی بنا کسی تعصب کا فراہم کرتے ہیں اور مقامی فضا میں نمو پا رہے اس جذبے کو بھی کہانی کا حصہ بناتے ہیں جس کی وافر موجودگی بڑے الٹ پھیر کا مصالحہ فراہم کرتی ہے نیز اس بات کی جانب اشارہ بھی کہ کیا آنے والے دن اس پرانے ایام کی بازیافت کر سکتے ہیں جہاں ایک غیر ملک سے آنے والی پارسی قوم کو شاہی حکومت سے انس نہیں بلکہ معاشرے کی رواداری سے انس ہے۔یہ بات بجا طور سے کہی جا سکتی ہے کہ بیگ احساس کہ یہ کہانی ان کی فنی بالیدگی کا بہترین نمونہ ہے۔

حواشی:

۱۔ بحوالہ اردو مابعد جدیدیت پر ایک مکالمہ، گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۱، ص ۳۳۲۔۳۳۳

۲۔ ''دخمہ''، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔

OOO

مضمون

راجندر سنگھ بیدی بحیثیت ڈراما نگار

نوشین عثمانی

آزادی کے بعد اُردو ڈرامانگاری کے میدان میں راجندر سنگھ بیدی کا نام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ بیدی کی ادبی شخصیت سے ہر کس و ناکس بخوبی واقف ہے۔ انہوں نے ناول، افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہی تھے اور ان کے فن کا یہی پہلو ان کے باقی پہلوؤں پر چھایا ہوا ہے۔ اور اسی اعتبار سے انہوں نے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے فکشن کے میدان میں جس مہارت سے اپنے فنی کارنامے انجام دیے ہیں اسے دیکھتے ہوئے بلاشبہ انہیں اُردو ادب کے معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدیؔ کی فنکارانہ صلاحیت اس بات میں پنہا ہے کہ انہوں نے ادب میں اپنے نئے مختلف تجربے اور نظریے کے ذریعے عوام کو اعلیٰ قدروں سے روشناس کرایا اور اپنے الگ اسٹائل اور فنی محاسن سے اُردو ادب کی گراں مایہ خدمات انجام دی۔ بیدی کا فن تصور کا فن نہیں بلکہ آزمائش کے تجربوں سے گزرنے کا فن ہے۔ ان کے فن میں فکر و نظر کا توازن، واقعہ کی صداقت اس لیے ملتی ہے کہ انہوں نے زندگی کی قدر و اہمیت کو محسوس کیا اور انسانیت کے اصول سے کام لے کر اپنے فرض کو بخوبی انجام دیا۔ بیدی نے اپنے عہد اور سماج کی تصویر کشی میں کسی طرح کی پابندی برداشت نہیں کی انہوں نے سماج کے ظلم و ستم کا مقابلہ کیا ہے۔ زمانہ کے نشیب و فراز، ناموافق حالات کی کشمکش، مصیبتوں اور پریشانیوں میں امید اور حوصلہ سے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ راجندر سنگھ بیدی کے فن میں پوشیدہ ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے بہت زیادہ لکھا اور بہت کچھ لکھا۔ مختلف اصناف میں لکھا۔ اور مختلف ذہنی سطحوں سے لکھا۔ ان کے ادبی انداز و بیان میں حسن کی لگن اور تڑپ ملتی ہے اور انسانوں سے ہمدردی و محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بیدی کے یہاں موضوع کی صداقت کا شعور بھی ملتا ہے۔ ان کا فن، تجربہ اور مشاہدہ کے زیر اثر گہرے فکر و شعور کا فن ہے۔ ان کا فنی خلوص اور جدید لب و لہجہ ادب میں ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ انہوں نے سماجی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی میلانات کو اپنے مخصوص نظر سے دیکھا اور اسے مختلف پہلوؤں سے پیش کیا۔ انہیں موضوع کی تلاش میں در بدر بھٹکنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ ان کے آس پاس کی بکھری زندگی ان کے موضوع و مواد کے لیے کافی ہوتی ہے۔ وہ موضوع سے زیادہ فن میں مہارت رکھتے ہیں اور اپنی اس فنی چابک دستی سے وہ موضوع کو اثر انگیز اور ناقابلِ فراموش بنا دیتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو موضوع بناتے ہیں جسے کسی اور نے اتنی سنجیدگی سے موضوع نہیں بنایا تھا یا کسی نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ وہ بیدیؔ کے لیے تخلیق و تصنیف کا مرکز بن جاتی ہیں۔

جیسا کہ راجندر سنگھ بیدی اُردو ادب کے عظیم افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ اُردو کے ایک کامیاب ڈراما نگار بھی ہیں۔ بیدی کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''بے جان چیزیں'' پہلی بار ۱۹۴۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جو چھ ڈراموں پر مشتمل ہے اور ان کی تعداد کچھ اس طرح ہے۔ وہ ہیں کار کی شادی، ایک عورت کی نہ، روح انسانی، اب تو گھبرا کے، بے جان چیزیں، اور خواجہ سرا وغیرہ۔ ''بے جان چیزیں'' کے ابتدا کے پانچ ڈراموں میں انسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو پیش

کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر کردار کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ان ڈراموں کے تمام کردار سماجی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔لیکن ان کی ذہنی کیفیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

کار کی شادی: راجندر سنگھ بیدی کے پہلے مجموعے ''بے جان چیزیں'' کا پہلا ڈراما ''کار کی شادی'' ہے۔جو دو مناظر پر مشتمل ہے۔اس ڈرامے کا مرکزی کردار شفیق اور اس کا ہمدرد دوست محمود ہے۔ڈراما نگار نے ابتدا میں ہی ان دونوں دوستوں کے مزاج اور رویے کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''شفیق ایک لا پرواہ، معصوم اور کھلنڈر سا چھوکرا ہے۔بخلاف اس کے محمود ایک سنجیدہ، روکھا اور ٹھیٹ ہندی میں کینا راسی لڑکا ہے۔ اس کی ہر بات میں ایک تیکھی طنز موجود ہے اور اپنے چہرے کی لکیروں سے وہ آزمودہ کار شخص دکھائی دیتا ہے۔''[1]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈراما نگار نے محمود کے خیالات کو برحق ثابت کیا ہے اور ان دونوں دوستوں کے ذریعے دوستی جیسے انمول رشتوں کی معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک عورت کی نہ:

''بے جان چیزیں'' کا دوسرا کامیاب ڈراما ''ایک عورت کی نہ'' ہے جو ایک منظر پر مشتمل ہے۔ یہ ایک مزاحیہ ڈراما ہے۔اس ڈرامے میں ڈراما نگار نے تیواڑی اور اس کی بیوی وسنتی کی نوک جھونک کو موضوع بنایا ہے۔ساتھ ہی ساتھ عورت کے جذبۂ نمائش کو ایک بے جان چیز ساڑی کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔

روحِ انسانی: اس مجموعے کا تیسرا ڈراما ''روحِ انسانی'' ہے۔ جو تین مناظر پر مشتمل ہے۔اس ڈرامے کا مرکزی کردار روح انسانی ہے۔اس ڈرامے میں ڈراما نگار نے نہ صرف ایک مصنف کو مرکزی کردار کی حیثیت دی ہے بلکہ اس کے جسم میں پورے عالم انسانیت کی روح کو کارفرما دکھایا ہے۔ برصغیر کی جہد آزادی اور اس کی کشمکش ہی اس ڈرامے کا خاص موضوع ہے۔اس ڈرامے میں ڈراما نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر عہد کا زندہ باشعور اور حساس ذہن ہی اقتدار اور بااختیار افراد کے ذریعے ظلم وستم کا شکار ہوتا رہا ہے۔اس سلسلے میں ڈرامے کا پہلا منظر ملاحظہ فرمائیں:

> ''جیل کا ایک کمرہ روح انسانی ایک دیوار کے سہارے جھکی ہوئی اور دونوں ہاتھوں سے سلاخیں تھامے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ سر کے بالوں کے دو گچھے سر جھکے ہونے کے باعث آنکھوں کو ڈھانپ رہے ہیں کبھی کبھی جب روح انسانی سر کو جھٹکا دے کر بالوں کو پیچھے ہٹاتی ہے تو اس کی آنکھوں کے بجائے صرف دو تاریک سے گڑھے دکھائی دیتے ہیں۔داڑھی کے بڑھے ہونے نے چہرے کی یاسیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ زنداں کے سامنے دفتر میں عام فرنیچر کے علاوہ کلاک اور کیلنڈر لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ایک بجلی کا ہنڈہ بھی روشن نظر آتا ہے۔کلاک تمثیلچے کا موٹف (Motif) ہے اس لیے اس کی آواز روح انسانی کے مطابق بلند یا مدھم کی جائے۔''[2]

اب تو گھبرا کے: ''بے جان چیزیں'' کا چوتھا ڈراما ''اب تو گھبرا کے'' ہے۔اس ڈرامے کا مرکزی کردار خلیل ہے۔ڈراما نگار نے اس ڈرامے میں خلیل کو بینک کی بے جان لیجروں اور پاس بوک

میں الجھا ہوا دکھایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خلیل کے ذریعے عوام کی سماجی ومعاشی الجھنوں اور مسائل کو زیر بحث موضوع بنایا ہے۔

بے جان چیزیں: اس مجموعے کا پانچواں ڈراما ''بے جان چیزیں'' ہے، جو چار مناظر پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے ڈاکٹر قدوائی اور ڈاکٹر مس سلیمہ کے عشق اور شادی شدہ زندگی کے دوران پیدا ہونے والے خیالات و جذبات کو دکان کے سائن بورڈ، چائے کی پیالی اور فوٹو فریم جیسی اشیاء کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈرامے کا اولین منظر ملاحظہ فرمائیں:

> ''تیز تندی اور جذباتیت اس تمثیلچے کی خصوصیت ہے کیونکہ دونوں کردار جوان اور جذباتی ہیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہنستے ہیں اور بلا ضرورت رو بھی دیتے ہیں۔ ان کی کسی حرکت سے چائے کی پیالی یا گلدان کا ٹوٹ جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔''[۳]

ڈراموں کا مجموعہ ''بے جان چیزیں'' کے یہ وہ پانچ ڈرامے ہیں جن میں ڈراما نگار نے انسان کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والی بے جان چیزوں کے عمل دخل اور ان سے پیدا شدہ اثرات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ''سات کھیل'' کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں کل سات ڈرامے شامل ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔ خواجہ سرا، چانکیہ، تلچھٹ، نقلِ مکانی، آج، رخشندہ اور پاؤں کی موچ وغیرہ۔

خواجہ سرا : راجندر سنگھ بیدی کے دوسرے مجموعے ''سات کھیل'' کا پہلا اور پہلے مجموعے کا آخری کامیاب ڈراما ''خواجہ سرا'' ہے۔ اس ڈرامے میں بیدی نے جذبہ محبت کو موضوع بنایا ہے۔ جو بیدی کے سماجی شعور وفن کا بہترین نمونہ ہے۔

چانکیہ : اس مجموعے کا دوسرا کامیاب اور دلکش ڈراما ''چانکیہ'' ہے۔ جو چار مناظر پر مشتمل ہے۔ بیدی نے اس ڈرامے میں ایک ایسی داستان محبت بیان کی ہے جس کا عہد مغلیہ شان وشوکت کا زوال اور موریہ خاندان کا عروج ہے۔

تلچھٹ : تلچھٹ تیسرا ڈراما ہے۔ جو ایک منظر پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں بیدی نے ایک ایسی بیوہ عورت کا کردار پیش کیا ہے جو یوگ نام کے لڑکے کو اپنے بیٹے کی طرح پالتی ہے اور وہ لڑکا اسے ماں کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک جگہ یوگ کہتا ہے :

> ''کہ تم نے مجھے اتنا لاڈ پیار دیا کہ آج میری سگی ماں بھی آجائے تو میں اس کے پاس نہ جاؤں، اور میں بڑا ہوکر، پڑھ لکھ کر صرف تمہارے لیے سب کچھ ہوں گا'' [۴]

نقلِ مکانی : تین مناظر پر مشتمل نقلِ مکانی اس مجموعے کا تیسرا بہترین اور کامیاب ڈراما ہے۔

''آج'' ''سات کھیل'' کا پانچواں ڈراما **''آج''** ہے۔ جو ایک منظر پر مشتمل ہے۔

اس مجموعے کا چھٹا ڈراما **''رخشندہ''** ہے۔ اس ڈرامے میں بیدی نے عورت کے دل میں مرد کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا بیان کیا ہے۔ شوہر کی گمشدگی کو لے کر رخشندہ کا نہایت ہی جذباتی انداز ملاحظہ فرمائیں :

> ''رخشندہ تم کہوگی وہی پرانی عادت..... آپا لیکن دیکھو کس قدر اندھیری رات ہے، بجلی کڑک رہی ہے حوصلے کے پَر جلے جاتے ہیں اور ''آپ'' ابھی تک نہیں آئے۔ اس وقت بارہ یا ایک بجا ہوگا۔ اللہ

جانے کدھر بیٹھ رہے ہیں۔'' ۵

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے اس ڈرامے میں عورت کے نرم و نازک احساس اور ان کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ جس سے انکار ممکن نہیں۔

پاؤں کی موچ : راجندر سنگھ بیدی کے دوسرے افسانوی مجموعے **''سات کھیل''** کا ساتواں اور آخری کامیاب ڈراما پاؤں کی موچ ہے۔ علاوہ ازیں بیدی نے چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں۔ جیسے ''دس منٹ بارش میں'' اور یہ ڈراما بھی ان کی کتاب ''سات کھیل'' میں شامل ہے۔

بیدی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ڈراما نگار کی حیثیت سے اپٹا سے بھی رہا ہے ۔ ان کا ڈراما ''نقلِ مکانی'' جس پر بعد میں جا کر فلم ''دستک'' بنی اپٹا کے زیر اثر ۱۹۴۸ء میں بمبئی میں اسٹیج کیا گیا۔ اس طرح بیدی نے اپٹا میں ڈراما نگار کی حیثیت سے کام کیا اور کامیاب و کامران بھی رہے۔ بیدی کے یہ تمام ڈرامے سماج کے درمیانی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں حقیقت کا گہرا رنگ پوشیدہ ہے۔

الغرض یہ کہ راجندر سنگھ بیدی کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی سماجی و سیاسی مسائل کو حل کرنے میں وقف کر دی۔ بیدی نے عصری اور روزمرہ زندگی کی ایک حقیقت کی بے لاگ، معروضی اور ایماندارانہ عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں حقیقت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ لہٰذا ان کی شخصیت اور ان کا فن قابل ذکر ہے۔

OOO

حواشی

۱- ڈراموں کا مجموعہ ''بے جان چیزیں'' راجندر سنگھ بیدی، ڈراما کار کی شادی، ص ۸، مکتبہ اردو ادب لاہور۔

۲- کلیات راجندر سنگھ بیدی مرتب وارث علوی، ص ۱۷۳-۱۷۴، جلد دوم، قومی کونسل فروغ اردو زبان۔

۳- بیدی نامہ، شمس الحق عثمانی، ص ۵۱۶، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جون ۲۰۰۷ء

۴- ''تلچھٹ''، ص: ۷۴-۷۷

۵- ''رخشندہ''، ص : ۱۸۴

این بی ٹی کے زیر اہتمام شائع انتھالوجی آج کی کہانیاں' میں نئے پرانے (52) افسانے شامل

اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مرتبہ نئی کتاب' آج کی کہانیاں' نیشنل بک ٹرسٹ کے ذریعہ شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے جس میں 52 بہترین اردو کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب آزادی کے بعد سے اب تک کے افسانوی سفر کو محیط ہے۔ یہ افسانے ساٹھ باسٹھ برس کے تخلیقی سفر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس انتخاب میں بلراج مین را' بلونت سنگھ' جوگیندر پال' جیلانی بانو' حیات اللہ انصاری' راجندر سنگھ بیدی' رام لعل' رتن سنگھ' رشید جہاں' سرلا دیوی' سریندر پرکاش' سہیل عظیم آبادی' عصمت چغتائی' غیاث احمد گدی' قاضی عبدالستار' قرۃ العین حیدر' کرشن چندر' گلزار' نند کشور وکرم' نیر مسعود وغیرہ کی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں آنند لہر' بیگ احساس' ترنم ریاض' خالد جاوید' ذکیہ مشہدی' ساحد رشید' سلام بن رزاق' سید محمد اشرف' شموئل احمد' شوکت حیات' صغریٰ مہدی' طارق چھتاری' عبدالصمد' غزال ضیغم' غضنفر' ف۔س۔اعجاز' فیاض رفعت' مظہر الزماں خاں' مشرف عالم ذوقی وغیرہ کی کہانیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

آپ بیتی

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع

یادیں

ان کا اصرار تھا کہ میں آ کے ان سے ملوں مجھے یہ احساس ہوتا کہ میں مل کر کہیں پھر سے ان راہوں میں بھٹک نہ جاؤں۔ میرا یورپ کا ویزا ابھی ایک مہینے کے لیے باقی تھا میں نے سوچا کہ میں واپس کیوں نہ چلی جاؤں۔ میں سسٹر جون اور روزیر انگلینڈ چلے گئے ان سے کہا میں کانفرنس میں جارہی ہوں ایک مہینہ بعد واپس آ کر آپ سے ملوں گی۔ ہم تو سوئٹزرلینڈ اور پھر جینوا چلے گئے۔ لیک جینوا پر ہمارا ہوٹل تھا کچھ دنوں بعد جینوا سے مانترو Montreux چلے گئے مانترو میں علی رہتے ہیں جو بیرسٹر نواب اکبر علی خاں کے صاحبزادے اور ایڈوکیٹ فیض النساء بیگم صاحبہ کے بھائی ہیں۔ کئی برسوں سے وہ باہر رہتے ہیں اب مانترو میں قیام ہے۔ جب میں وہاں پہنچی تو ان کے دوست Baronness مجھ سے ملنے ہوٹل آئیں۔ میں تھک کر سوگئی تھی۔ بیدار ہوئی ان سے ملی جاتے ہوئے انہوں نے کہا کل آپ ہمارے پاس ضرور آئیں۔ ہم لوگ مقررہ وقت پر ان کے گھر پہنچے۔ چھوٹا سا خوب صورت گھر، بڑا سا باغیچہ جس میں ہمہ قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے زیادہ تر گلاب تھے بڑے بڑے خوش گلاب ٹھنڈی ہوا سے جھوم رہے تھے علی حیدرآباد کی خبریں سن کر خوش ہو رہے تھے۔ وہ حیدرآباد سے دور تھے لیکن ان کے گھر کی دیواروں پر حیدرآباد کی مختلف تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے والد سے تو میں واقف تھی وہ پاپا کے دوست تھے۔ ان کی صاحبزادی محبوبیہ میں میری کلاس میٹ تھیں۔ علی میرے پہلے شوہر راجا سری کرشن جی کے ایک دوست تھے جو امریکہ میں تھے ان سے میری ٹیلی فون پر بات کروائی۔ ان دوست سے نہ میں کبھی ملی، نہ جانتی تھی۔ ان کا نام معلوم تھا سری کرشن کے دوست مجھے پہچانتے تھے انہوں نے مجھ سے میرے اور میرے والد کے بارے میں سوالات کرتے رہے طویل گفتگو رہی مگر آج بھی یاد نہیں کہ وہ کون تھے۔ علی راجا سری کشن کے کلاس میٹ تھے۔ علی وہیل چیئر پر تھے پوچھا تو بتایا کہ گاڑی سے ایک ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا جان بچ گئی لیکن چلنے پھرنے سے مجبور ہوگئے۔ وہ سفید لینن کے سوٹ میں تھے سر پر ٹوپی تھی جو کانوں تک اُتر آئی تھی اس ایکسیڈنٹ میں ان کے ایک کان پر کوئی خطرناک چوٹ لگی تھی جسے وہ اپنی ٹوپی سے چھپائے رکھتے تھے۔ بات بات پر موٹی موٹی حیدرآبادی گالیاں دے رہے، تھے Baronness کو بھی۔ لیکن Baronness ان گالیوں کو کیا سمجھتی۔ وہ بڑے مہمان نواز تھے۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے سسٹر اور قدیر خاموش بیٹھے تھے انہوں نے سوچا ہوگا کہ یہ دونوں بور ہو رہے ہیں تو ان سے کہا ''جاؤں اندر جاؤ جا کر خوب کھاؤ اس کے باپ کا گھر نہیں ہے'' میں حیران تھی کہ یہ اس عورت کے بارے میں جو ان کی ہر طرح سے خدمت کرتی ہے اسے یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ توہین آمیز لہجہ نہیں تھا محبت بھرا لہجہ تھا۔ بار بار علی کہہ رہے تھے اب کی بار جب آپ مانترو آئیں میرے گھر کے سامنے والی ہوٹل میں رکیں۔ ہم لوگ کچھ دور کے فاصلے پر ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ہماری ہوٹل کے سامنے Lake Geneva کا خوب صورت منظر تھا۔ یہ جھیل فرانس تک جاتی تھی جس کا پانی میٹھا اور صاف ستھرا تھا۔ فرانس بھر میں Avein Drinking Water ہی پیا کرتے تھے جس کے بارے میں خیال تھا کہ یہ پانی صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ یورپ جان کے بعد شاید علی ایک دوبار ہی اپنی مختلف بیویوں کے

ساتھ حیدرآباد آئے ہوں گے۔ ان میں سے ایک بیوی سے میں جنیوا میں ملی تھی ہماری ملاقات ایک چاکلیٹ کی دکان پر ہوئی تھی وہ چاکلیٹ کی دکان چلاتی تھیں۔ عمر کے اعتبار سے جوانی کی منزلوں سے گزر چکی تھیں۔ ان کی ایک لڑکی تھی جو Law کر چکی تھی اور گورنمنٹ میں نوکری کر رہی تھی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صاحبہ اپنے آپ کو پرنسیس آف حیدرآباد کہلواتی تھیں۔ انہوں نے میرے پاس کئی میگزین بھیجے تھے۔ ان میگزین میں ان کی اور ان کی بیٹی کی تصاویر تھیں ان پر لکھا تھا Princess of Hyderabad جب انہیں معلوم ہوا کہ میں مانٹر وبھی جا رہی ہوں تو فون دے کر علی کو اطلاع دی کہ میں آ رہی ہوں مجھ سے ملیں۔ انہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ میں علی اور ان کے خاندان بھر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔

دوسرے دن Baronness ہمارے پاس آئیں اپنی موٹر میں ہمیں گھمانے لے گئیں ایک Shop پر ٹھہر کر ہمارے کیمرہ میں موجود ان کی تصویروں کو کاپی کروایا اور پھر ہوٹل پر چھوڑ کر چلی گئیں۔

ہماری ہوٹل کے اس پار Lausonne Hall تھا جہاں میری بہن کا اسکول تھا۔ جس Finishing اسکول میں رینوکا دیوی میری بہن پڑھتی تھی وہیں مہارانی گائتری دیوی نے بھی تعلیم حاصل کی تھی اس لڑکیوں کے اسکول کے روبرو لڑکوں کا اسکول تھا جس میں پرنس آغا خاں، پرنس فیصل کا ایک لڑکا بھی پڑھتا تھا جو بعد میں چل کر سعودی عربیہ کا وزیر خارجہ بنا۔ کنگ فیصل کی دو بیٹیاں رینوکا دیوی کے ساتھ اسکول میں تھیں۔ جب میں وہاں جاتی تو رینوکا کے ساتھ ان کے دونوں بیٹیوں اور پرنس آغا خاں اور پرنس سعودی عربیہ کو لنچ پر لے جاتی تھی۔ پاپا کے بہت سے دوست ایسے تھے جو پاپا کو ہمارے خلاف اکساتے تھے کسی نے یہ بھی کہا کہ آپ نے اپنی بیٹی کو اتنے قیمتی Finishing School میں کیوں پڑھایا۔ میں جانتی تھی کہ اس Finishing اسکول میں داخلہ بڑا مشکل تھا۔ داخلے سے پہلے وہاں آپ کو پورے خاندان کی تفصیل بتانی پڑتی تھی ساتھ ہی ساتھ کوئی مقامی شخص اسٹوڈنٹ کا گارڈین ہونا چاہیے تھا۔ ایم کے ویلوڈی ان دنوں سوئٹزرلینڈ میں سفیر تھے۔ ویلوڈی سے ہمارے خاندانی روابط تھے انہوں نے خوشی خوشی رینوکا کا گارڈین بننا قبول کیا۔ پاپا نے جب مجھ سے پوچھا تم نے رینوکا کو آکسفورڈ کیوں نہیں بھیجا یہاں کیوں پڑھا رہی ہو تو میں نے پاپا سے ادباً سوال کیا پاپا کیا آپ رینوکا سے نوکری کروانے والے ہیں وہاں پڑھ کر اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ یہاں تو اس Finishing اسکول میں اس کے کلاس میٹ دنیا بھر کے لوگوں سے ہوگی اس کے دوست دنیا بھر میں اونچے مقام پر ہوں گے اس سے بہتر جگہ رینوکا کے لیے اور کیا ہوگی، پاپا خاموش ہو گئے۔

میں یورپ میں تھی لیکن فون پر برابر منّو سے ربط میں تھی وہ کہتے تھے بیمار ہوں گرمی بلا کی ہے، تڑپ رہا ہوں۔ یہاں میرا کوئی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ یورپ سے واپسی پر میں حیدرآباد جانے سے پہلے ممبئی پہنچی شام میں ان سے ملنے ان کے فلیٹ پر گئی۔ یہ ہماری پچاس سال بعد پہلی ملاقات تھی وہ لفٹ کے پاس کھڑے تھے۔ میرے باہر آتے ہی مجھے جھٹ سے گلے لگالیا اور پھر یکدم سے الگ ہو گئے اس وقت میرے ساتھ اور بھی لوگ تھے اور ان کے پیچھے ان کے بھی کچھ لوگ تھے۔ ایک شخص جوان کے پیچھے کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں گلدستہ تھا، گلدستہ لے کر مجھے دیا جس میں ایک درجن گلاب تھے ولایت میں سب سے بڑا گلدستہ بارہ عدد پھولوں کا ہی ہوتا ہے اس سے بڑھ کر پھول اس میں نہیں ہوتے۔ اس روایت کو انہوں نے یہاں ممبئی میں

بھی باقی رکھا۔

ان کے بال سفید ہوگئے تھے مجھے عجیب سا لگا کیوں کہ جب میں نے انہیں پچاس سال پہلے دیکھا تھا ان کے سر پر خوب صورت گھنے بال تھے انہیں بھی مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی ہوتی اس وقت میرے بال خاصے لمبے تھے میں جوڑا بناتی تھی اب میرے بال کٹے ہوئے تھے میں ولایت سے ان کے لیے ان کا پسندیدہ کلون لائی تھی۔ان کے روم میں میرے لیے کرسی رکھی ہوئی تھی وہ کہہ رہے تھے اب میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا چلتا بھی نہیں ہوں زیادہ تر بستر پر لیٹا رہتا ہوں۔ مجھے تعجب ہوا کہ کیسے یہ شخص چوبیس گھنٹے بستر پر پڑا رہتا ہوگا۔اتنے میں ان کا ایک آدمی ہمارے لیے ''پوہے'' بنا کر لایا پوہے مہاراشٹرا کی خاص ڈش ہے میں مہاراشٹرا میں بڑی ہوئی تھی انہوں نے اصرار کیا اور خود ایک چمچ کھایا کہا میں زیادہ نہیں کھا سکتا۔ان کے بستر کے سامنے والی میز پر ایک گروپ فوٹو تھی جس میں منّو بہت موٹے دکھائی دے رہے تھے مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص جو بستر پر پڑا ہوا ہے کبھی اتنا موٹا تازہ بھی رہا ہوگا میں نے پوچھ لیا یہ کون ہے؟ کہا ''میں ہوں۔میری بیٹی کی جب شادی ہوئی تھی اس وقت کی یہ فوٹو ہے ہم نے ویلنگٹن کلب میں دعوت دی تھی۔ میں اس وقت خوب پیتا تھا تین بار ہارٹ اٹیک آیا تھا۔اس وقت میں ہاکپن کا ڈائریکٹر تھا۔''ہاکپن'' ممبئی کا مشہور ریسرچ سنٹر ہے جہاں دیوانے کتے، سانپ ، بچھو اور زہریلے جانوروں کے کاٹے کی دوائیوں پر ریسرچ ہوا کرتا ہے۔وہ باتیں کرتے کرتے اپنی ماضی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کرنے لگے۔ کہنے لگے میں بچی کو اسکول چھوڑ کر ہاکپن جاتا تھا اور واپسی میں اسے لے آتا تھا پھر پکوان کرتا تھا بچی کو پڑھاتا تھا میں نے بات کاٹ کر کہا ان پچاس برسوں میں، میں سمجھتی تھی کہ آپ مجھے بھول گئے ہوں گے'

''مسکراتے ہوئے کہا'' میں نے آپ کو اپنے دل سے جانے کب دیا۔ پچاس برس کی دوری تو ہوگئی مگر میں آپ کے بارے میں دور نہیں ہوا عثمانیہ یونیورسٹی میں کئی بار Viva کے لیے گیا۔ وہاں بھی آپ کے بارے پوچھتا تھا ان لوگوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ میں زیادہ دیر وہاں رکتا بھی نہیں تھا صبح آتا اور شام کے جہاز سے واپس ہو جاتا تھا۔''کبھی فون تو دے سکتے تھے آپ'' میں نے گلہ کیا'' کہاں دیتا فون سنا تھا آپ کی شادی کسی تلگو پوئٹ سے ہوگئی ہے۔ میں نے سوچا شادی کے بعد آپ چلی گئی ہوں گی۔ میں خاموش ہوگئی۔ میں اسی دن یورپ سے آئی تھی تھکی ہوئی تھی دیڑھ گھنٹہ ان کے ساتھ بیٹھ کر واپس ہوگئی۔اب میں صبح شام ان سے فون پر بات کرتی تھی انہوں نے ایک دن بتایا کہ ان کی ایک آنکھ چلی گئی ہے۔مگر مجھے تو ایسا محسوس نہیں ہوا، کہا اب کی بار آپ مجھے غور سے دیکھنا، میں پڑھ نہیں سکتا اور ہاتھ میں رعشہ آ گیا ہے۔اس لیے لکھ بھی نہیں سکتا'' مجھے یہ سب سن کر بڑی تکلیف ہوئی اپنے وقت کا Handsome انسان آج کتنا مجبور ہو گیا ہے۔

امریکہ میں اپنی مصروف ترین زندگی کے بارے میں بتا رہے تھے کہ وہ اپنی بچی کی تعلیم میں بہت دلچسپی لیتے تھے اگزام آتا تو اس کے پاس جا کر اس کی اسٹڈی میں مدد دیتے تھے ان کی بیوی گائنا کالوجسٹ تھی وہ رشین جانتی تھی ۔رشین پڑھانے کے لیے وہ امریکہ سے رشیا چلی گئی تھی۔ بچی کی ذمہ داری ان ہی پر تھی گھر کا کام بھی کرتے اور پکاتے بھی تھے۔میں نے اندازہ کیا کہ ان کے اور ان کی بیوی کے تعلقات کچھ اچھے نہیں۔مگر میں نے پوچھا نہیں کسی کی خانگی زندگی میں، میں کیوں دخل دوں۔ دھیرے دھیرے ان ہی سے معلوم ہوا کہ بیوی کچھ عجیب قسم کی تھی صبح اٹھ کر اپنا ناشتہ خود بناتی کھاتی اور کام پر چلی جاتی تھی منّو کو اپنا ناشتہ خود بنانا پڑتا تھا۔میری سسٹر جون ان کے نوکروں سے خوب باتیں کرتی تھی

اس سے معلوم ہوا کہ بیوی نے اپنے انتقال سے پہلے اپنی کار بیچ دی تھی اور ٹیکسی لے کر ہاسپٹل جاتی تھی۔ منّو کے پاس دو گیارہ بج تھے جواب خالی پڑے تھے۔ ''جب گاڑی نہیں ہے آپ کے پاس تو یہ گیارہ بج کیوں ہیں، کہا جب میری بیٹی پڑھ لکھ کر واپس آئے گی ممبئی تو اسے گیارہ بج کی ضرورت ہوگی اسی لیے گیارہ بج قائم رکھا ہے، مجھے انداز ہوا کہ وہ بیٹی کو کتنا چاہتے ہیں کتنا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی یہ اکلوتی بیٹی تھی میں نے ہنستے ہوئے پوچھا کیوں ایک ہی بیٹی ہے آپ کی؟ کہا میری بیوی اس کے بعد Friged ہوگئی تھی۔ مجھ سے دور دور رہنے لگی تھی۔ ایک دن انہوں نے کہا یقین کیجئے میں آپ کے لیے روتا تھا'' آپ میرے لیے روتے تھے'' ہاں وہ جب مجھ سے لڑتی تھی تو آپ بہت یاد آتی تھیں'' آپ کی تو محبت کی شادی تھی انہوں نے آپ کو چاہ کر شادی کی تھی پھر لڑائیاں کیوں ہوتی تھیں وہ تو آپ کے لیے امریکہ تک چلی گئی تھی بہت زمانے تک آپ کے ساتھ رہیں۔ جب ہی تو میں نے سوچا تھا کہ آپ دونوں کو شادی کر لینی چاہیے'' میں نے کہنے کو کہہ تو دیا پر پریشان ہوگئی کہ دکھی باتوں کو میں نے کیوں کریدا کیوں انہیں تکلیف دی۔ دوسرا خیال آیا چلو یوں تو اس شخص کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ سننا بھی ایک تھراپی ہے اور دل کی بھڑاس نکالنا بھی ایک تھراپی ہے۔ ایک روز ان کا فون آیا کہا داماد کا فون آیا تھا میں نے اسے بتایا کہ میں اب بہت خوش ہوں کیوں کہ My old flame has come back یہی بات میں نے اور لوگوں سے بھی کہی ہے۔ انہوں نے کہا جس روز ان کی بیوی کا انتقال ہوا وہ اکیلے تھے۔ رات بھر اپنے روم میں تنہا بیٹھے رہے۔ ممبئی میں کون کسی کو پوچھتا ہے لیکن بازو کے فلیٹ میں ایک پارسی فیملی رہتی تھی اس فیملی کے جو صدر خاندان تھے وہ آکر رات بھر ان کے ساتھ روم میں بیٹھے رہے اور پھر صبح بیوی کے رشتہ دار آئے ساری تیاریاں کیں منّو تو آرتھی کے ساتھ جا نہیں سکتے تھے گھر ہی سے آرتھی کو وداع کیا۔ اس کے بعد ان کی بیٹی اور داماد آئے گوا میں منّو کی بہت پراپرٹی تھی بچی اور داماد وہاں گئے ہوئے تھے اس وقت منّو سے میری فون پر بات ہوئی انہوں نے بیٹی کو بتایا میں واپس آگئی ہوں تو بیٹی کو اطمینان ہوگیا کہ کوئی تو ہے ان کی دوست جوان سے بات کرتی ہے ورنہ منّو سے بات کرنے والے ان کے دو نوکر تھے۔ پھر ان کے ڈاکٹرز، منوا خبار نہیں پڑھ سکتے تھے صبح چھ بجے ریڈیو نکالتے خبریں سنتے انہیں کلاسیکل میوزک اور غزلوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ کھانا بھی کم کھاتے تھے ان کے لیے صرف چکن سوپ بنتا تھا۔ ایک دن فون پر انہوں نے بتایا کہ صبح کچھ نہ کچھ میٹھا ضرور کھانا چاہیے کیوں کہ رات میں باڈی میں شوگر کم ہو جاتی ہے۔ انہیں شوگر تھی اب نہیں تھی میں نے پوچھا کیسے شوگر کا مرض ختم ہوا کہا میں سخت پرہیز کرتا تھا اور پرہیز ہی شوگر کا بہترین علاج ہے۔ وقتاً فوقتاً میری صحت کے بارے میں پوچھتے اور مشورے دیا کرتے تھے گویا اب وہ میرے ڈاکٹر بن گئے تھے۔ ایک دفعہ جانے ان کے دل میں کیا آیا کہا ''چلیے'' ہم رجسٹرار کے پاس جائیں گے میں خالی الذہن تھی میں نے پوچھا کونسے رجسٹرار؟ کہا ''جو شادی کرواتا ہے، مجھے دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ وہ پلنگ پر تھے شادی کے قابل نہ وہ تھے نہ میں اب اس کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی۔ شادی ہوتی بھی تو میں کیا کرتی۔ ان کی نرس بن کر رہنا پڑتا تھا دوست تو تھی ہی بہ حیثیت دوست ان کی زندگی بھر کے دکھڑے سننا پڑتا تھا۔ مجھے ان سے ہمدردی تھی، فون کر سکتی تھی مگر اس سے زیادہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک دن کہا ''میں جب امریکہ جا رہا تھا آپ نے مجھے عمر خیام کی رباعیات کی ایک کتاب دی تھی میں نے جہاز میں جاتے جاتے اسے پورے کا پورا یاد کر لیا تھا۔ ایسا حافظہ تھا اس شخص کا اور اب کتنا مجبور ہوگیا ہے۔ میرے روم میں آپ کی تصویر تھی میں اپنے ملنے والوں سے اکثر کہا کرتا تھا میں اس Princesses سے شادی

کرنے والا ہوں۔مگر آپ نے تو کسی اور سے شادی کر لی''ہاں وہ جب ہوا جب برسوں آپ کے خط نہیں آئے اور نہ میرے پاس کوئی ذریعہ تھا آپ تک پہنچنے کا۔امریکہ میں کوئی اکیلا رہ بھی نہیں سکتا۔ ان حالات میں وہ ایک لڑکی جو مجھ سے عمر میں بڑی تھی میرے پیچھے پڑ گئی پھر ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہنے لگے آخر شادی کرنی ہی پڑی میں آپ کے سوا کسی اور کو چاہتا بھی نہیں تھا۔اس شادی سے مجھے کئی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔وہ سمجھتی تھی میں کوئی مہاراجہ ہوں۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ امریکہ میں میری تعلیم کے زمانے میں باوا کے پاس سے اتنی ہی رقم آتی تھی جو میری پڑھائی کا خرچ اٹھا سکے اور تھوڑا بہت زیادہ خرچ کے لیے۔شاہ خرچی کے لیے نہیں شام میں وہ ڈرنک لیتی تھی جو مجھے ہی بنا کر دینی پڑتی تھی میں بھی وہسکی پیتا تھا جب میں یونیورسٹی سے آتا تھا تو برتن دھونا گھر صاف کرنا، پکانا پڑتا تھا وہ باہر ہی باہر رہتی تھی رات میں کسی وقت آتی تو بتاتی تھی کہ کہاں وقت گزارا، کیسے وقت گزارا، کس کے ساتھ رات گزاری، میرے باوا کو اس نے یہ باور کروا دیا تھا کہ میں بالکل بیکار آدمی ہوں وہ بھٹک گئی تھی وہ کہتی تھی ہٹلر کے زمانے میں کتنے ہی جیوز کا Prostitution ہوا میرے خاندان کا بھی ہوا اس لیے یہ سب کچھ کر رہی ہوں۔اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ شادی کے بعد ممبئی آئے ماں سے تو بہو کی بنتی تھی وہاں ان کے کئی ولا زتھے ان میں سے ایک ولا انہیں بھی رہنے کے لیے دے دیا گیا تھا۔یہاں بھی راتوں میں وہ چلی جاتی تھی صبح آتی۔اور رات کے قصے سناتی۔یہ سن سن کر خون کھولنے لگتا تھا۔میں نے اس جھگڑے سے نجات پانے کے لیے سائنس کی راہ اختیار کی اور اپنی Wrestling Life کو کچھ کارآمد بنا سکا آخر میں ایک بڑا سائنٹسٹ بن گیا۔

OOO

☆ بیگ احساس کے پاس موضوعات کا تنوع ہے اور وہ اپنے طرزِ بیان میں ایسی لوچ و لچک رکھتے ہیں کہ ہر موضوع کا حق ادا ہو جاتا ہے بعض افسانوں میں چونکا دینے والا پیرایہ اور چونکا دینے والا انجام افسانوں کو نکھار دیتا ہے۔ ان کے افسانے فکری گہرائی کے حامل ہوتے ہیں۔اس فکری عنصر نے یہاں جامعیت پیدا کر دی ہے وہ کفایت لفظی سے کام لیتے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دیتے ہیں۔

سلیمان اطہر جاوید

دَخمہ

بیگ احساس

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

طنز و مزاح

سو ختنی نہ فروختنی

پانچویں دہائی کے ابتدائی تین چار برسوں میں جب فیض کی کوئی نظم یا غزل جیل سے اسمگل ہو کر ادبی حلقوں میں بطور سوغات تقسیم ہوتی تھی تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا۔ ''منھ سے نکلی کوٹھوں چڑھی'' کا صحیح مفہوم اسی زمانے میں سمجھ میں آیا کہ ہر ادب دوست کی زبان پر فیض کی کسی نظم کا کوئی مصرع یا غزل کا کوئی شعر ہوتا۔ آج کل تو شاعر اور شاعری دونوں کی مقبولیت و شہرت کا انحصار گانے والوں پر ہوتا ہے لیکن اس زمانے میں گانے والے شاعر کو شاعر نہیں بناتے تھے۔ شاعر جو کچھ بنتا تھا اپنے ہی زورِ سخن سے بنتا تھا۔ انھیں دنوں کی بات ہے کہ جیل سے ایک غزل ایسی بھی آئی جو فیض کی نہیں تھی مگر جس کا ایک شعر فیض کے شعروں ہی کی طرح دلوں میں گھر کر گیا۔ شعر یہ تھا:

کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے زندان میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے

یہ شعر حسن عابدی کا ہے جو ان دنوں فیض اور سجاد ظہیر سے ارادت مندی کی بنا پر داخل زندان تھے۔ سجاد ظہیر سے ارادت مندی کچھ زیادہ ہی تھی اور یہی ارادت مندی سجاد ظہیر کی گرفتاری کا سبب بنی۔ ہوا یہ کہ جب حسن عابدی کو گرفتار کر کے تشدد کیا گیا اور ان سے سجاد ظہیر کی قیام گاہ کا پتا پوچھا گیا تو انھوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے قیام گاہ کی نشان دہی کر دی۔ حسن عابدی کو معلوم تھا کہ سجاد ظہیر کسی بھی خفیہ ٹھکانے پر دو تین روز سے زیادہ نہیں ٹھہرتے، لہٰذا پولیس جب نشان زد خفیہ ٹھکانے پر جائے گی تو سجاد ظہیر وہاں سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہوں گے۔ مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ پولیس اس ٹھکانے پر پہنچی تو گویا اپنی منزل مراد پر پہنچ گئی۔ ممکن ہے بعض لوگ سجاد ظہیر کی گرفتاری کو حسن عابدی کے نامہ اعمال کی سیاہی سے تعبیر کریں اور خود حسن عابدی بھی اس صورت حال سے خوش نہیں تھے۔ وہ اپنے ''جرم بے گناہی'' پر بے حد نادم تھے۔ سجاد ظہیر کی گرفتاری کی خبر سن کر ان کا جو حال ہوا، اسے انھوں نے ایک جگہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے: ''ان کی گرفتاری میرے لیے ایک کرب ناک سانحہ تھا جس نے میری روح کو بری طرح پامال اور زخموں سے چور چور کر دیا''۔ لیکن ہمارے نزدیک سجاد ظہیر کی گرفتاری اردو ادب پر ایک بہت بڑا احسان تھا۔ اگر سجاد ظہیر پابند سلاسل نہ ہوتے تو اردو زبان ''روشنائی''، ''ذکر حافظ'' اور ''نقوش زندان'' جیسی فکر انگیز کتابوں سے محروم رہ جاتی۔ ہمارا بس چلے تو مچھ (بلوچستان) کے سنٹرل جی کی جس کال کوٹھری میں بیٹھ کر سجاد ظہیر نے یہ کتابیں لکھیں، اس کی دیوار پر ایک یادگاری لوح نصب کرا دیں جس پر یہ عبارت لکھی ہو:

''حسن عابدی کا بے حد شکریہ کہ ان کی وجہ سے سجاد ظہیر اس کوٹھری تک پہنچے اور یہاں انھوں نے ایسی کتابیں لکھیں جو اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہیں''۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ سجاد ظہیر سے متعلق جملہ معترضہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی حسن عابدی کے اس شعر کی جو زندان کی چہار دیواری سے نکل کر پورے ملک میں خوش بو کی طرح پھیل گیا۔ یہ حسن عابدی کا پہلا بھرپور ادبی تعارف تھا اور یہ اسی شعر کا کمال تھا کہ جیل جانے سے پہلے حسن عابدی کمیونسٹ پارٹی کے ایک غیر معروف کارکن تھے لیکن پونے تین سال بعد جیل سے باہر آئے تو وہ ایک ادبی شخصیت بن چکے تھے۔ مگر المیہ یہ ہوا کہ وہ ایک قید خانے سے رہا ہونے کے بعد ایک دوسرے قید خانے میں داخل ہو گئے اور یہ صحافت کا قید خانہ تھا۔

صحافت کا کمال یہ ہے کہ وہ ادیب کے تخلیقی جوہر کے لیے زہر ہلاہل کا کام کرتی ہے۔ صحافی بن کر کیسے کیسے ادیب ادبی دنیا میں نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئے! حسن عابدی اس کان نمک میں پہنچ تو گئے لیکن خوش قسمتی سے پوری طرح نمک نہ بن سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر کے شاعر نے صحافت کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شعر کہتے رہے اور گاہے گاہے ان کی تخلیقات ادبی رسالوں میں شائع بھی ہوتی رہیں لیکن وہ صحافی ہی کی حیثیت سے پہچانے جاتے رہے۔ ان کی شاعری کی شہرت ایک خاص حلقے تک محدود رہی۔

پاکستان میں صحافت اور پولیس دو شعبے ایسے ہیں جو اپنی خوش عنوانیوں کی وجہ سے خاصا رعب اور دبدبہ رکھتے ہیں۔ صحافت کو البتہ پولیس پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ پولیس والوں سے عام شہری ڈرتے ہیں اور صحافیوں کے سامنے پولیس والے بھی کچ پنیدیے بن جاتے ہیں۔ پولیس پر اس پیشہ ورانہ برتری کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض صحافی صحافت کے پردے میں بادشاہی کرتے ہیں اور کچھ شاعری سے بھی شوق فرمانے لگتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے ہر دوسرے مصرعے کا پہلے مصرعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ان دو مصرعوں میں سے بھی ایک ناموزوں ہوتا ہے۔ یہ صحافی شاعر دیکھتے ہی دیکھتے ''ممتاز شعراء'' میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ کوئی انھیں اس خوش فعلی پر ٹوکتا نہیں۔ ٹوک بھی کیسے سکتا ہے۔ دریا اور مگرمچھ والی ضرب المثل ہونٹوں پر مہر خاموشی ثبت کر دیتی ہے۔

حسن عابدی اگر چاہتے تو اپنی صحافیانہ حیثیت کو اپنی شاعری کے ''فروغ'' کے لیے استعمال کر سکتے تھے لیکن انھوں نے صحافت کی بیساکھیوں سے کام لینے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ بیساکھیاں صرف معذوروں کے استعمال کے لیے ہوتی ہیں۔

جس ملک میں لوگ شاعری شروع کرنے سے پہلے ہی مجموعہ کلام شائع کر دیتے ہوں، وہاں حسن عابدی جیسے خوش نوا شاعر کا نصف صدی کی مشقِ سخن کے بعد بھی مجموعہ شائع کرنے سے گریزاں رہنا بڑے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔ خدا بھلا کرے سحر انصاری اور بعض دوسرے دوستوں کا جن کے پیہم اصرار سے ریزہ ریزہ بکھرا ہوا شاعر ''نوشتِ نے'' کی صورت میں سامنے آیا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی گم شدہ دولت ہاتھ آ گئی ہو۔

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہم جب بھی کسی شاعر کی یا اس کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں تو بیمار پڑ جاتے ہیں اور یوں جھوٹ بولنے کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے لیکن اس وقت ہمیں سچ بولنے کی بھی سزا مل رہی ہے کہ حسن عابدی کی شاعری کی تعریف کے لیے مناسب الفاظ دستیاب نہیں ہو رہے۔ بہرحال ہم اس قدر تو ضرور کہیں گے کہ پاکستان میں جو بے مزہ اور روایتی قسم کی شاعری ہو رہی ہے، حسن عابدی نے ''نوشتِ نے'' کی صورت میں اس کا کفارہ ادا کر دیا۔ بہت دنوں بعد ایک ایسا مجموعہ شائع ہوا ہے جسے جدید اردو شاعری کے چند نمایندہ مجموعوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ترقی پسندوں کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ ان کی شاعری میں نظریہ تو ہوتا ہے، نظر نہیں ہوتی۔ حسن عابدی نے اس الزام کو بڑی خوب صورتی سے مسترد کر دیا ہے اور وہ اس طرح کہ ان کے ہاں نظریہ شاعری کو مسخ نہیں کرتا بلکہ بین السطور میں اپنا جادو جگاتا ہے۔ حسن عابدی کی غزلیں ہوں یا نظمیں دونوں میں اردو شاعری کی روایات کی مکمل پاس داری ملتی ہے اور ساتھ ہی نئے حالات اور نئے تقاضوں کے پیشِ نظر پرانے لفظوں اور شعری پیکروں کو نئے مفاہیم و مطالب عطا کرنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ عام ترقی پسندوں کی طرح وہ نعروں سے سمع خراشی نہیں کرتے، دل و دماغ دونوں کو نہایت شائستہ پیرائے میں متاثر کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ

واحد ترقی پسند شاعر ہیں جن کا نام فیض کے نام کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس دعوے کی دلیل کے طور پر حسن عابدی کی کچھ غزلوں اور نظموں کے حوالے سے گفتگو کی جائے لیکن اس طرح یہ کالم نظیر صدیقی کا تنقیدی مقالہ بن جائے گا۔ تاہم ایک ایسی غزل کے چند اشعار سنائے بغیر نہیں رہا جا سکتا جو آج ہی کے دور میں لکھی جا سکتی تھی اور جسے حسن عابدی ہی لکھ سکتے تھے:

شہرِ ناپرساں میں کچھ اپنا پتا ملتا نہیں
بامِ و در روشن ہیں لیکن راستا ملتا نہیں
حاکموں نے شہر کے اندر فصیلیں کھینچ دیں
دن میں بھی اب کوئی دروازہ کھلا ملتا نہیں
آشنا چہروں سے رنگِ آشنائی اڑ گیا
ہم زباں اب خشک پتوں کے سوا ملتا نہیں

حسن عابدی نثر بھی اچھی لکھتے ہیں۔ ان کی صحافیانہ نثر تو ہم نے نہیں پڑھی لیکن ادبی تحریریں جو ادھر اُدھر شائع ہوتی رہتی ہیں نظر سے گزری ہیں۔ سجاد ظہیر کا شخصی خاکہ انھوں نے بہت اچھا لکھا تھا۔ رسالہ ''افکار'' میں بطور مہمان مدیر وہ کبھی کبھی اداریے لکھتے رہتے ہیں جو خاصے فکر انگیز ہوتے ہیں۔ ایک ایسا ہی اداریہ جو گزشتہ مہینے کے افکار میں شائع ہوا ہے اس وقت ہمارے سامنے ہے جس میں انھوں ادب کی مقبولیت کے مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔ اسی اداریے پر کالم لکھنے کا ارادہ تھا لیکن موصوف کی شاعری نے گمراہ کر دیا اور آدھے سے زیادہ کالم مقدمہ شعر و شاعری بن کر رہ گیا۔ خیر کالم میں جو تھوڑی سی جگہ رہ گئی ہے اس میں مذکورہ اداریے سے استفادے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس اداریے کا آغاز اس پریشان کن جملے سے ہوتا ہے کہ شاعر کو سخن شناس اور ادب کو اپنا قاری نہیں ملتا۔ اس کے بعد کتابوں کے فروخت نہ ہونے، کتابوں کی دکانوں کے بند ہونے اور ان کی جگہ جوتوں کی دکانیں کھل جانے پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ اس افسوس میں ہم برابر کے شریک ہیں لیکن مختلف وجوہ کی بناء پر صورت حال وہ نہیں جو عابدی صاحب نے بیان کی ہے۔ سخن شناس اور ادب کے قاری تو موجود ہیں مگر خود ادب منظر سے غائب ہے، یہ جو رسالوں میں اور کتابی صورت میں طوامیر اغلاط شائع ہوتے رہتے ہیں، اگر انھیں کو آپ ادب کہتے ہیں تو پھر کتابوں کی دکانوں کی جگہ جوتوں کی دکانیں کھلنے پر خوش ہونا چاہیے کہ جوتے بہر حال انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ پہننے کے کام بھی آتے ہیں اور چلانے کے بھی۔ اس کے برعکس ادب کا یہ حال ہے کہ سو ختنی نہ فروختنی۔ ادب کے معیار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ کاغذ بازار میں سونے کے بھاؤ بکتا ہے جب اس پر شاعری یا افسانے چھپ جاتے ہیں تو ردّی کے بھاؤ بھی نہیں بکتا۔ یہاں تک کہ لوگ اعزازی نسخے لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ ایسا بھی کیا اعزاز جو حاصل کرنے والے کے لیے شرمندگی کا باعث ہو۔

پچھلے دنوں طرح دار (نہ کہ مصرع طرح بردار) شاعر ظفر اقبال نے کہا تھا کہ موجودہ ادب کو دریا برد کر کے ہمیں نئی ادبی روایات قائم کرنی چاہیے۔ حسن عابدی نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے اور کہا کہ ایسا کرنا بے نتیجہ عمل ہوگا۔ ہمیں ظفر اقبال اور حسن عابدی دونوں سے اتفاق نہیں ہے۔ ادب کو دریا برد کرنے کا نتیجہ نہایت نقصان دہ ہوگا۔ ساری دنیا میں یہ مہم چل رہی ہے کہ سمندروں اور دریاؤں کو آلایشوں سے پاک رکھا جائے۔ ہم اگر اس کے برعکس عمل کریں گے تو دنیا کیا کہے گی؟

حسن عابدی نے اس رائے کا اظہار بھی کیا ہے: ''وہ ادیب جو ادب میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، ان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میرؔ اور غالبؔ کے زمانوں میں بہت سے ایسے شاعر تھے جن کی بدولت ایسی چہل پہل اور تہذیبی سطح پر ایسی گہما گہمی پیدا ہوئی جس میں بڑے شاعروں کی تخلیقی امنگ اور اپج

بروئے کار آئی۔ وہ اربابِ فن جن کے نام آج یاد نہیں، خود تو کھاد بن گئے لیکن اس کھاد سے وہ قد آور درخت نمو پا سکے جن کے سائے شام ابد تک پھیلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور جن کے پھلوں کی حلاوت خوش ذوق لوگوں کو ہمیشہ شاد کام رکھے گی''۔

حسن عابدی نے اپنا موقف ایسی خوب صورت نثر میں بیان کیا ہے کہ ان کی بات مان لینے کو جی چاہتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ دور کے بیشتر ادیب کسی آنے والے میرؔ اور کسی آنے والے غالبؔ کے لیے کھاد کا کام کر رہے ہیں اور ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اکادمی ادبیات ہمارے ملک کا کھاد بنانے والا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔

حسن عابدی کو اس پر بھی اصرار ہے کہ ادب کو اچھے اور بُرے کے درمیان تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ادب اچھا یا برا نہیں ہوتا، بس ادب ہوتا ہے۔ ''تخلیقی عمل کے مرحل میں تخلیق کار کو یہ کب یاد رہتا ہے کہ وہ کس درجے کا شعر یا ادب تخلیق کر رہا ہے، اسے تو اپنے دل کا خون ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے''۔

حسن عابدی صاحب! آپ کو تخلیق کار کا خون ہوتا ہوا دل تو نظر آ گیا۔ کبھی فرصت ملے تو سخن شناسوں اور ادب کے قارئین کے دلوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ یہاں بھی آپ کو خون کے سوا کچھ اور نظر نہیں آئے گا۔

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ'' ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگا رنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، پروفیسر شمیم حنفی، فکر تونسوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شہریار، یوسف ناظم، مرزا ظفر الحسن، پروفیسر یوسف سرمست، رفعت سروش، پروفیسر بیگ احساس، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، علی باقر، کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو ''جیسا دیکھا جیسا پایا'' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ، محمد علی صدیقی، علی باقر، عارف حسینی، بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ'' مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رضیہ فصیح احمد، مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، علی ظہیر، حسن چشتی، ڈاکٹر افسر کاظمی، زاہد علی خاں، من موہن تلخ، انور سدید، مخمور سعیدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، علیم صبا نویدی، قمر علی عباسی، مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی، کمار پاشی، رشید انصاری، حامد اکمل، طاہر مسعود، فیروز عالم، حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

محمد مظہر الزماں خان

افسانہ

ایک اجنبی کہانی (خلیل مامون کے نام)

کون ہو تم ؟ اور اس بے رنگی گھر کے اندر کیسے اور کب چلے آئے کہ یہ ہمارا گھر ہے کئی لوگوں نے جو گیروی لباس میں ملبوس تھے۔ بیک وقت کرخت آواز میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا کہ ان کی آنکھوں کے اندر سائے گھوم رہے تھے۔ جیسے بھنور میں کئی منظر ڈال دیئے گئے ہوں۔

''کون سے۔ تمہاری کیا مراد ہے؟ وہ جس کے پاؤں کے چاروں طرف جڑیں پھیلی ہوئی تھیں ان سبھوں کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر اپنی جڑوں کو دیکھنے لگا جو زمین کے اندر پھیلی ہوئی تھیں۔

''تم ہمارے سوال کو سمجھ رہے ہو۔؟ یا یوں ہی سوال پر سوال قائم کرنا چاہتے ہو۔''

پھر سبھوں نے کہا۔''ہم وہی کہہ رہے ہیں جو ہم نے کہا ہے کہ۔ تم کون ہو اور یہاں تمہاری موجودگی کا یا ہونے کا کیا جواز ہے؟!

''یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ، وہ بولا۔ چنانچہ سبھوں نے پھر وہی سوال دھرایا کہ تم کون ہو اور پھر ہمارے اس گھر میں کیسے چلے آئے؟

''کیا مطلب؟؟۔ اس نے حیرت سے کہا کہ اس کے لب پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے اس گھر میں کیوں اور کس طرح داخل ہوئے''؟ سبھوں نے ایک ایک لفظ کو دانتوں میں چباتے ہوئے کہا''.....اب بھی سمجھ میں آیا کہ نہیں یا پھر سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔!

''دیکھئے آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں کہیں اور سے اس گھر میں چلا آیا ہوں''۔ وہ بولا غور سے سنئے کہ میں اسی گھر کا ایک مکیں ہوں اور اس وقت سے یہاں موجود ہوں جس وقت سے آپ موجود ہیں کہ ہم سب کی موجودگی ہی اس گھر کی شناخت ہے.....اور گھڑی کی سوئیوں کی طرح صدیوں سے اسی گھڑی کے ڈائل کے اطراف گھوم رہے ہیں اور گھومتے گومتے گھڑی کے کانٹوں سے کٹ کٹ کر لمحوں کی طرح گرتے چلے جارہے ہیں اور ان لمحوں کو یہ زمین اپنی کوکھ میں اتارتی چلی جارہی ہے کہ گھڑی کے ڈائل پر ہم الگ الگ ہندسے ہیں تاہم ڈائیل پر ہی موجود ہیں۔ چنانچہ ہمہ اقسام کے رنگ۔ بے شمار شاخیں۔ ان گنت پتے۔ پھول، پھل۔ درخت اور ان درختوں کی جڑیں۔ ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور سارے کے سارے اس زمین پر موجود ہیں کہ وجود کی تقسیم کی شکل ہے۔

''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو، سبھوں نے اپنے اپنے دانتو کو دباتے ہوئے کہا.....ہم یہ کب رہے ہیں کہ تم ہمارے اس گھر میں کیسے چلے آئے اور تم گھڑی، کانٹوں، درختوں، چھاڑیوں، شاخوں او وجود اور بے وجود کی باتیں کر رہے ہو''۔ سبھوں نے کہا۔ ہم نہ گھڑی کو مانتے ہیں، تم اس کے ڈائیل اور اس کی تاریخ کو تسلیم کرتے ہیں لہذا صاف صاف الفاظ میں جواب دو کہ اس گھر میں تمہاری موجودگی کے کیا معانی ہیں اور کیا جواز ہے۔

''یہ دروازے، دیواریں، کھڑکیاں، دہلیزیں، آنگن وغیرہ میرے وجود کے گواہ ہیں وہ بولا''۔ اس گھر کی زمین کا ایک ایک ٹکڑا کھود کر دیکھ لو کہ ہر جگہ میری آنول تمہیں نظر آئیگی۔ پھر اجنبی

کیسے ہوگیا۔اور سنو! وہ چند لمحوں کے لئے رکا اور پھر بولا.....جس طرح اس گھر کی زمین میں تمہاری جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اسی طرح میری بھی جڑیں اس پوری زمین میں اندر تک پھیلی ہوئی ہیں تم انھیں دیکھ کر پہچان بھی نہ سکو گے کہ ہماری جڑوں کا جال اس گھر کے پورے آنگن میں گچ مچ گچ مچ پھیلا ہوا ہے یہ گھر ہمہ اقسام کے درختوں کا باغ ہے۔وہ پھر کچھ لمحوں کے لے رکا اور پھر ان کے سخت چہروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

ایک بیج ..... کئی پیڑ..... اور ان پیڑوں پر ان گنت کیڑے۔ ایک دوسرے پر سوار..... ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے.....کترتے ہوئے.....سیکڑوں شاخیں اور ان شاخوں سے لپٹے ہوئے زہریلے سانپ..... بے شمار پتے..... ہرے، پیلے، زرد پیلے، سرخ اور ان پتوں پر لا تعداد جراثیم۔اور شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اور گر گر کر پیدا ہوتے ہوئے زخم زدہ بیمار موسم..... آباد بے آباد رات دن، گھومتی، چکراتی ہوئی چمگادڑیں.....گرم، سرد۔تند و تیز، آوارہ، مشتعل، بے قابو پاگل ہوائیں..... رنگ برنگے منظروں کو فنا کرتے ہوئے بارود کے بادل.....طاغوتی طوفان اور ان طوفانوں میں پوشیدہ عفریت..... ایک دوسرے کے ہم شکل، ہم مزاج ..... ہم خیال..... زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے دابۃ الارض اور ان گنت ہتھیار.....جسموں کو چاٹتے ہوئے.....لہولہان کرتے ہوئے۔

.....ایک بیج

اور.....ان گنت کہانیاں.....اور سنو.....اس نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور اس نے کاغذ کی ایک کشتی بنائی.....اور اس کشتی میں خود ہی بیٹھ گیا۔

اور پھر کشتی ..... دریا میں ڈال دی.....ایک بیج.....ان گنت کہانیاں .....'' لگتا ہے کہ تم کوئی پاگل شاعر ہو.....'' ان سبھوں نے کہا''اور مسلسل اوٹ پٹانگ بکواس کئے جا رہے ہو..... ہم کہہ رہے ہیں کہ تم اس گھر کے آدمی نہیں ہو کہ ہماری یہ آنکھیں جو تمہیں دیکھ رہی ہیں اور جن آنکھوں سے تم ہمیں دکھائی دے رہے ہو۔یعنی نظر آ رہے ہو وہ تصدیق کرتی ہیں کہ تم اس گھر کے کبھی تھے اور نہ کبھی رہیں گے.....سبھوں نے گرجدار آواز میں کہا تو وہ بولا.....تم اپنی جن موجودہ آنکھوں سے دیکھنے کی باتیں کر رہے ہو یعنی گواہی دے رہے ہو۔اور جن موجودہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے ہو۔دراصل وہ تمہاری اپنی اصل آنکھیں نہیں ہیں کہ تم سبھوں نے اپنی اصل آنکھوں کو کہیں چھپا رکھا ہے اور موجودہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے ہو جو مصنوعی ہیں یعنی اصلی نہیں ہیں بلکہ نقلی ہیں جنہیں تم نے اپنے اپنے چہروں پر مکھوٹوں کے ساتھ لگا رکھی ہیں.....انھیں نکال کر اپنی پیدائشی آنکھوں سے مجھے دیکھو..... میں تمہیں صاف وشفاف نظر آؤں گا.....

اور تبھی آسمان پر اچانک مہیب گہرے گہرے سیاہ بادلوں کے دل کے دل آ کر چاروں طرف پھیل گئے تو ان کی آنکھیں اپنے مقام سے نکل کر زمین پر آ گریں تھیں اور پھر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا تھا اور وہ سب کے سب ایک دوسرے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔تاہم کوئی کسی کو مل نہیں رہا تھا کہ سب کے سب بکھر گئے تھے۔گم ہو گئے تھے.....!!!

OOO

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

مجیر احمد آزاد

افسانہ

نیا کلینڈر

''ایک حادثہ ہو گیا سر جی!''۔ میرے آتے ہی چپراسی نے بتایا۔ میں نے متحیر ہو کر اسے سوالی نظروں سے دیکھا۔

''دیکھئے نا! کیسا سناٹا پسرا ہوا ہے۔''

میں نے کلاس روم کی طرف نگاہ دوڑائی، واقعی خاموشی تھی۔ چہار جانب بچوں کو تلاش کرتی ہوئی میری آنکھیں ناکام ہو کر پھر اسی پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ آگے بولتا رہا۔

''دسواں کا لرکن سب کے بیچ بہت مارا ماری ہو گیا سر جی۔ اور پھر ہندو مسلمان والا پھیلنگ پھیل گیا ہے۔'' اس نے عجیب سی شکل بناتے ہوئے بتایا تو لمحہ بھر کے لئے مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور پھر ایک ٹیس کا احساس پورے جسم میں پھیل گیا۔ ایسا لگا جیسے کانٹا چبھ گیا ہو۔ میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اسٹاف روم کی جانب چل پڑا۔ اندر سے ملی جلی آوازیں باہر آ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اسٹاف روم میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ کئی کلیگز کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ مجھے عجیب سا لگا۔ مجھے یہ خاموشی پردہ داری والی لگی۔ پھر موضوع بدل کر باتیں ہونے لگیں لیکن جلد ہی خاص موضوع بحث میں آ گیا۔ پنڈت اومکار مشرا آنکھیں نچاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''جانتے ہیں انصاری جی، ایسے لڑکے سب ہی کل ہو کر آتنک وادی بن جائیں گے۔ بتایئے تو بھلا، کیا یہ اچت ہے کہ ہمارے دیوی دیوتا کے فوٹو پھاڑے جائیں۔''

میں اس وقت تک خود کو تیار کر چکا تھا۔ مجھے ان سے ایسی ہی گفتگو کی امید تھی کہ کچھ لوگ ایسے حساس موقعے پر اپنی زبان سے آگ لگانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ پنڈت جی انہیں میں سے ایک تھے۔ میں کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ سائنس ٹیچر پریم کمار نے ٹوکا۔

''سر تو ابھی آ ہی رہے ہیں جب تک پوری گھٹنا جانیں گے نہیں تو پھر کیا بتائیں گے۔ دونوں طرف کی بات سامنے آئے تو نا!''

''ہاں! میں تو پنڈت جی کے وانی میں ہی اس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال سننا چاہوں گا کیوں کہ پنڈت جی بھگوان ہنومان کے بھکت ہیں، جھوٹ تو کبھی بول ہی نہیں سکتے۔ اور ہم سب کا کیا عام انسان، غلطیوں کا پتلا.....''

میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا کہ اسٹاف روم قہقہوں سے ڈوب گیا اور پنڈت جی جھینپ کر خاموش ہو گئے۔ سبھی کے پاس اس حادثہ کی اپنی اپنی کہانی تھی اور ہر کہانی میں نمک مرچ تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ مسالا مذہب کی دکان سے حاصل کیا گیا تھا۔ میں وہاں صرف ''میں'' نہیں تھا بلکہ مسلمان تھا جس پر انگلی اٹھانے کا حق جیسے ہر ایرے غیرے نے خود سے حاصل کر لیا ہو۔ دفتر ہو یا پبلک پلیس ہمارا مذاق اڑانے اور ٹیز کرنے کے لئے بس کوئی نام چاہئے یا اخباری بیان۔ اس سے دو چار تو تقریباً سبھی مسلمان ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ بات یہ تھی کہ دسویں کلاس کے دو لڑکے داؤد اور جٹا شنکر کے بیچ پہلے بحث و تکرار ہوئی۔ اس کے بعد دونوں آپس میں الجھ پڑے، ہاتھا پائی شروع ہوئی پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کے دوستوں نے اسکول کو میدان جنگ بنا لیا۔ کافی مشقت کے بعد اس پر قابو پایا جا سکا۔ واقعہ تو یہی تھا اور آگے ہندی ٹیچر گجادھر مہتو کی بات سے میں متفق تھا۔ اس کی کہانی تھوڑی سچی لگی۔

''ہنگامے کے بعد ہیڈ سر نے چھٹی دے دی اور دونوں گروپ کے لڑکوں کو روک لیا لیکن جٹا شنکر باہر چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد پانچ چھ لوگوں کے ساتھ واپس آیا۔ باہر سے آئے لوگوں نے کافی ہنگامہ کیا اور مسلم لڑکوں کو سزا دینے کی بات کرنے لگے۔ ان لوگوں نے ہندو علاقے میں میاں جی بچوں کی اس حرکت کا انجام بھگتنے کی دھمکی بھی دی۔ ہیڈ سر کو بھی غصہ آ گیا انہوں نے ان سب کو کھڑی کھڑی سنائی اور اسکول میں ہنگامہ کرنے اور ہمارے بچوں کو مارنے کی دھمکی دینے کے لئے پولیس میں کمپلین کر دینے کی بات کی۔ تب جا کر وہ سب واپس گئے۔ آج ہی ڈسپلین کمیٹی کی بیٹھک ہوگی۔ ہیڈ سر نے کہا کہ قصوروار کو اس کی سزا ضرور ملے گی۔''

میں فکر مند ہو گیا۔ اسکول میں لڑکوں کے درمیان اختلاف عام بات ہے اور اس کو سلجھانے میں کسی بھی ٹیچر کو کوئی دشواری نہیں آتی ہے۔ ان کی نگاہ میں سبھی اسٹوڈنٹ ہوتے ہیں ۔بعض اوقات تو نام پوچھنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ مگر آج کا سانحہ کچھ الگ تھا۔ معاملہ مذہب تک جا پہنچا تھا۔ میرے چہرے پر فکر کی لکیریں آ جا رہی تھیں اور میں خود کو مطمئن دکھانے کی کوشش میں لگا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے ہیڈ سر نے طلب کیا اور کمیٹی کی کاروائی شروع ہوئی۔

ہیڈ ماسٹر چیمبر میں ہم پانچ ٹیچرز کنارے کی کرسیوں بیٹھے ۔ ہیڈ ماسٹر میدنی رائے سامنے موونگ چیئر پر آنکھیں موندے کسی گہری فکر میں غوطہ زن تھے۔ ان کا پروقار چہرہ بجھا بجھا سا تھا جیسے کسی درد میں مبتلا ہوں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں تب کھولیں جب داؤد اور جٹا شنکر کو پیش کیا گیا۔ داؤد کے چہرے پہ مایوسی تھی۔ وہ ہاتھ پیچھے کئے نگاہیں جھکائے کھڑا تھا۔ جٹا شنکر کے چہرے پر اب بھی تناؤ تھا جیسے جھگڑے کے لمحات سے باہر نہ آ سکا ہو۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ تن کر کھڑا تھا۔ کمرے کی خاموشی کو چیرتی ہوئی ہیڈ سر کی آواز بھری۔

''پہلے تم بتاؤ داؤد کیا ہوا تھا۔ اور ہاں! تم سے مجھے سچائی کی امید ہے، بھروسا مت توڑنا۔''

داؤد نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گویا ہوا۔'' سر جی، میں جب اسکول آیا ہمارے کلاس میں بہت کم لڑکے آئے تھے۔ میں نے دوسرے بینچ پر اپنا بستہ رکھا اس سے بینچ ایکدم خالی تھا۔ پھر میں باہر میدان میں چلا آیا۔ اسمبلی کے بعد جب میں کلاس میں گیا تو میرا بستہ سب سے آخری بینچ پر رکھا تھا۔ میں نے جٹا سے پوچھا تو اس نے بدتمیزی کی۔ میں اپنا بستہ لیکر دوسرے بینچ پر کنارے بیٹھ گیا وہاں جگہ تھی۔ اس پر صرف تین لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے پھر بدتمیزی کی، مجھے گالی دینے لگا۔''

''اس نے تم سے کیا کہا، صاف صاف بتاؤ۔''

اس نے میری طرف دیکھا، آنکھیں ملیں اس کی پلکیں جھک گئیں ۔وہ چند ساعت خاموش رہا، پھر گویا ہوا۔

'' سالے بھاگو یہاں سے، میاں جی ہو پاکستان جاؤ۔ کٹا ہو۔ یہ اسکول بھی ہمارا ہے۔ اتنا ہی نہیں اس نے ہم کو گالی دی اور مسلمانوں کو آتنک وادی کہا۔''

''اور تم نے اس کو مارا اور کلاس میں لگا ہوا کلینڈر جس پر دیوی کی پرتیمانی ہوئی تھی اسے نوچ ڈالا۔'' پنڈت اومکار مشرا ٹپک پڑے۔

''نہیں.....نہیں سر.....وہ.....''

''اچھا اب تم چپ رہو اب جٹا شنکر بتائے گا۔ ہاں تم اپنی بات رکھو، مار پیٹ کی نوبت کیوں آئی۔ تم تو ایک ہفتہ سے اسکول آئے بھی نہ تھے۔ سچ سچ بتانا کیا ہوا تھا۔'' ہیڈ سر نے پوچھا۔

'' ہم اس کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ ہم براہمن

شودھیہ شاکاہاری اور یہ مسلمان۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے، یہاں تم بھی اسٹوڈنٹ اور داؤد بھی اسٹوڈنٹ۔'' میدنی رائے نے ذرا سختی کی۔

''تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہماری سرسوتی ماتا کے فوٹو کو پھاڑ دیگا اور ہم دیکھتے رہیں گے؟ چوڑیاں نہیں پہنی ہیں ہم نے۔'' اس کی گفتگو سے نفرت کی بو آرہی تھی۔

''سر جی! میں ایسا کبھی نہیں کرتا۔ یہ فوٹو ہمارے کلاس میں ایک سال سے لگا ہوا ہے۔ اس نے آج مجھے چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ دیکھتے نہیں یہ کلاس بھی ہمارا ہے۔ دیوی کی فوٹو دکھاتے ہوئے اس نے کہا کہ ہماری دیوی میا ہے تم میاں جی کا یہاں کیا کام۔ سر جی! اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اب جب فوٹو نہیں تو کلاس سب کا۔ آپ ہی کہتے ہیں نا کہ اسکول سب کا ہے تو پھر ہندو دھرم کی موتی ہی کیوں سر۔ سبھی دھرموں کے کلینڈر لگنا تھا نا۔ اس نے صحیح کہا ہے سر اب یہ فیصلہ ہو جانا چاہئے کہ کیا اسکول صرف ایک دھرم کا ہے؟'' وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوا اور پھر جٹا شنکر کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم کے کہا تھا نا کہ ہم پاکستان جائیں یہ ملک تمہارا ہے۔ تو سنو اس وقت تم غصے میں تھے سن نہیں سکے ابھی کان کھول کر سن لو۔ یہ ملک ہمارا ہے، ہم مسلمانوں نے بھی تم سے کم قربانیاں نہیں دی ہیں۔ چاہے ملک کی آزادی ہو یا یہاں کی ترقی ہم سب برابر کے بھاگیدار ہیں۔ تم اس طرح مسلمانوں کو برا نہیں کہہ سکتے۔''

''تو اسکا مطلب جو چاہو کروگے، آتنک وادی کون ہے اس سے کب تک انکار کروگے''

مشرا جی نے پھر زہر اگلا۔ داؤد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا اب مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا۔

''مشرا جی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ٹریرسٹ ہیں۔ دماغ صاف کیجئے اپنی غلطیوں کو چھپانا چھوڑیئے۔ پوجا پاٹ سے سمے نکال کر تھوڑا بہت اسٹڈی کیجئے۔ پتہ چل جائے گا کہ دنیا کہاں جارہی ہے اور کیا سوچ رہی ہے۔ ابھی فی الحال اس معاملہ کو دیکھئے۔''

ہیڈ سر نے مجھے روکا۔ ''انصاری جی آپ تو کم سے کم چپ ہو کر گھٹنا کی جڑ تک پہنچئے اور شرما جی ہم لوگ اپنے اسٹوڈنٹس کے جھگڑے کو نبٹانے بیٹھے ہیں۔ ہندو مسلم کرنے کے لئے نہیں۔ ٹیچر کو یہ بھید گھاؤ شوبھا نہیں دیتا۔''

''میدنی بابو بات تو اصل وہی ہے نا!'' شرما جی ڈھیٹائی پر اتر آئے۔

''نہیں! آپ کی باتوں سے نفرت کی بو آرہی ہے۔ سوچ بدلئے، مشرا جی۔'' ہیڈ سر نے انہیں خاموش کیا اور جٹا شنکر سے مخاطب ہوئے۔

'' جو داؤد نے بتایا، کیا بات اتنی ہی تھی نا! جٹا شنکر؟''

''داؤد اور شکنتلا کے بیچ افیئر چل رہا ہے۔'' جٹا شنکر نے بتایا۔

میں نے محسوس کیا داؤد بے چین ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے کی بدلتی رنگت چغلی کھا رہی تھی۔ مجھے اس بات احساس نہیں تھا کہ یہ چیپٹر بھی بحث میں آجائے گا۔

''اب لیجئے۔ یہ ہندو لڑکی سے پیار بھی کرتا ہے۔ بھگوان ہی مالک ہے اس اسکول کا۔'' مشرا جی نے دیدے نچاتے ہوئے کہا۔

''یہ فالتو باتیں کیوں کر رہے ہو جٹا شنکر؟ میں داؤد کو پرسنلی جانتا ہوں۔ وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں بھی اچھا ہے۔ اس کی کوئی شکایت بھی نہیں ملی ہے آج تک۔ کیوں افواہ

پھیلا رہے ہو۔ابھی پڑھنے لکھنے کی عمر ہے تمہاری ،نیتا گری کی نہیں۔''فزیکل ٹیچر کمل پاسوان نے سمجھایا۔

''آپ اسی سے پوچھ لیجئے کہ شکنتلا سے پیار کرتا ہے کہ نہیں۔''جٹاشنکر نے یقین کے ساتھ کہا۔ایک منٹ تک خاموشی چھائی رہی،مشرا جی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلی رہی،داؤد سر جھکائے کھڑا رہا پھر بول پڑا۔

''ایک دم غلط ہے سر جی۔مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔ہمکو اپنی سرحد معلوم ہے۔ہندو مسلم بھی پتا ہے مگر سر جی اسکول میں ہم سب برابر ہیں ،کوئی مذہبی دیوار نہیں، کوئی اونچ نیچ نہیں۔جو گندگی پھیلا رہا ہے وہی صفائی کا لکچر دیتا ہے سر جی۔''

''اس نے اروند سدا کے ساتھ ملکر ہم کئی ساتھیوں کو مارا۔یہ گروپ بندی کرتا ہے سر۔''جٹاشنکر نے پھر مورچہ سنبھالا۔

اروند سدا کو بلایا گیا۔اس نے آتے ہی بتایا ۔''سارا دوش جٹاشنکر کا ہے سر۔فساد کی جڑ بھی یہی ہے۔''

'جٹاشنکر تو ایک ہفتہ کے لئے کسی کیمپ میں گیا تھا۔وہ تو ادھر تھا بھی نہیں اور تم کو فیصلہ دینے کے لئے بلایا نہیں گیا ہے بلکہ یہ بتاؤ تم سب نے داؤد کا ساتھ کیوں دیا؟'' ہیڈ سر نے پوچھا۔

''سر یہ ہمارا ساتھی ہے۔کوئی فیلنگ نہیں کرتا ،ساتھ بیٹھتے ہیں ،کھیلتے کودتے ساتھ ہیں کھاتے پیتے بھی.....''وہ ایک پل کے لئے رکا اور مشرا جی کی طرف نگاہ ڈالی پھر بتانے لگا۔

''جٹاشنکر کہتا ہے وہ براہمن ہے سبھی جاتیوں (ذاتیوں) میں سروتم (سب سے اچھا)۔وہ بھید بھاؤ بھی کرتا ہے۔جب ہم لوگ دونوں کو الگ کرنے گئے تو اس نے ہم سب کو بھی گالی دی اور دسادھ چمار کہا۔ہم نیچی ذاتی میں پیدا ہوئے اس میں ہمارا کیا قصور ہے سر جی۔''وہ یکا یک خاموش ہو گیا۔

''جٹاشنکر تم نے اسکول کے جھگڑے کو باہر پہنچایا۔ تمہارے من میں یہ دروچار کہاں سے آرہا ہے؟میں تمہارے گارجین سے بات کروں گا۔آئندہ اس طرح کی غلطی رپیٹ نہیں ہونی چاہئے ،یہ وارننگ ہے۔'' اپنے تمام دلائل اور حربے سے ناکام جٹاشنکر نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''تم نے بھی مار پیٹ کی ،یہ ڈسپلین کے خلاف ہے ۔میں تم سے الگ سے بات کروں گا۔''انہوں نے داؤد سے کہا۔

''جی سر،آپ اپنے شاگرد داؤد کو اسکول سے نکال دیجئے مگر مسلمان داؤد کو مت نکالئے۔اسکول سب کا ہے ایسا کچھ نہیں کیجئے کہ دوسرے مذہب کو ماننے والے کے دل کو ٹھیس پہنچے ۔دیش بھی سب کا اور سبھی اس دیس کے ہیں۔''

دونوں کو گلے ملایا گیا اور فی الوقت معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔کمیٹی کی نشست پوری ہوئی۔ہیڈ سر کے ساتھ صرف میں ہی چیمبر میں رہ گیا۔میں اب وقت پرستی کے سحر سے باہر آچکا تھا،گرچہ اس میں فائدہ زیادہ تھا۔مگر داؤد کے حوصلے اور سچائی نے جو آگ میرے اندر لگائی تھی اسے میں بجھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔کاش میں نے بھی کبھی تھوڑی سی ایماندارانہ کوشش کی ہوتی تو کچھ نہ کچھ اچھا ضرور ہوا ہوتا۔ میں نے چیمبر چھوڑنے سے پہلے ہیڈ ماسٹر میدنی رائے کو بتایا۔

''سر جی !اگر آپ اجازت دیں تو سامنے کی دیوار پر سے مورتی ہٹا کر باپو کی تصویر لگا دیں۔'' ہیڈ ماسٹر میدنی رائے مبہوت ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔میں مسرور تھا اور اپنی شناخت پر نازاں بھی۔

OOO

محبوب پاشاہ اعظمی

افسانہ

شیخن بی

شیخو کو وہ بہت پسند تھی اور وہ بھی اسے بہت پیار کرتی تھی شیخن بی کا بھرا بھرا جسم گندمی رنگ والی جلد میں سمٹا جاتا نہ تھا۔ شیخو تو دیوانہ ہو گیا تھا۔ دونوں جوان تھے، جوانی کے مزے روز لوٹتے رہے۔ شادی کے دو سال اس طرح گزر گئے۔ پتہ نہ چلا۔ تیسرے سال جب ان کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو شیخو کی ماں جہاں دیدہ عورت تھی سوچتی اور فکر مند ہو جاتی۔ دو تین سال بعد بھی ان کے بچہ نہ ہوا، وہ منتیں مرادیں مانگتی درگاہوں آستانوں کی خاک چھاننے لگی۔ جب چار سال بعد کچھ نہ ہوتا نظر آیا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

محلے کی عورتیں شیخو کی ماں کو باتوں باتوں میں بیٹے کی اولاد نہ ہونے کا طعنہ دینے لگیں..... ''خالہ! شیخو کی شادی ہوئے چار سال ہوتے ہیں ابھی تک بچہ نہیں'' کیا بات ہے؟ کیا بات ہے! شیخو کی ماں کو معلوم ہوتا تو بتا دیتیں! وہ صرف اتنا کہہ دیتی ''اللہ کی مرضی، کب اولاد دے''۔ ادھر رشتے دار بھی شیخو کی ماں کو تنگ کرتے، کیوں اب تک اس کا بیٹا صاحب اولاد نہیں؟ شیخو کی پھوپی منہ پھٹ تھی، کہنے لگی، شیخو کو شادی کیے چار سال اوپر ہوئے ابھی تک بچے نہیں! ہمارے سلیم کو دیکھو شادی کے ایک سال میں اسے بیٹا ہوا۔ اور میری نجمہ بیٹی نے تو بچوں کی لائن لگا دی ہے۔ اور جانے کیا کیا کہتی رہی، شیخو کی ماں سب سنتی، برداشت کرتی، کچھ بھی نہیں کہتی، نہ اپنی بہو کو کبھی کوسہ اور نہ اپنے بیٹے سے کوئی شکایت! اللہ پر چھوڑ دیا۔ ''اولاد نصیب میں ہے تو وہ ضرور دے گا''۔

رشتے دار آخر رشتے دار ہیں اتنا کہہ چکنے کے بعد بھی تسلی نہیں ہوئی۔ پھوپی نے مشورہ دیا۔ ''بہن..... میری مانو بیگم بازار والے حکیم صاحب کو بہو کو دکھاؤ، اللہ نے بہت شفا دی ہے ان کے ہاتھوں میں..... اصلی بات کا پتہ ہو جائے گا''۔ اس طرح کا مشورہ سن کر شیخو کی ماں پریشان نہیں ہوئی صرف اتنا کہا۔ ''بہن حکیم صاحب کے پاس بہو کو لے جانے میں کوئی برائی کیا؟ آج ہی میں بہو بیٹے کو حکیم صاحب کے پاس لے چلتی ہوں''۔ پھوپی نے دوسرا مشورہ دیا۔ ''ڈاکٹری علاج کرنا ہے تو ڈاکٹر نریش کمار کا نام بہت ہے اور جن کی اولاد نہیں ڈاکٹر صاحب کے علاج سے اولاد ہوئی ہے''۔

شیخو کی ماں سب سنتی رہی۔ لیکن پھوپی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ شیخو کی ماں شیخو کی شادی کے دوسرا سال پورا بھی نہیں ہوا تھا، اپنی بہو شیخن بی کو ساتھ لیے درگاہوں پر منتیں مانگتی اپنے بیٹے اور بہو کے نام کا مزار پر ناڑا باندھا، اس نے بہو سے نفل روزے بھی رکھوائے۔ شیخن بی روز درود تاج پڑھتی پابندی سے بات یہاں تک نہیں تھی۔ شیخو کی ماں نے نقلی بابا، اور جعل سازوں کے ہاتھوں پیسہ برباد کیا، اور تو اور ایک سادھو مہاراج کے کہنے پر اس نے گائے کو اپنے گھر سے پکا کر روٹیاں بھی کھلائیں۔ ایک رنگا ہوا سیاہ بابا دعویٰ کرتا تھا، وہ بانجھ عورتوں کو اولاد دیگا اور اس علاج میں ان عورتوں کے ساتھ دست درازی کرتا ان کے خاندان کے افراد کی موجودگی میں..... جو اولاد سے مایوس ہوتیں گی سب کچھ برداشت کر لیتیں۔ شیخو کی ماں اپنی بہو کو اس رنگا ہوا سیاہ فراڈ بابا (جو بعد میں اسے پولیس نے گرفتار کیا تو پتہ چلا خود اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے) کے پاس بھی لے گئی تھی۔ شیخو کی

ماں پچھلے دوسال سے یہ سب کرتی رہی تا کہ بہو ماں بن جائے۔مگر شیخو کی ماں آخر ماں تھی وہ سارے عمل اس نے کیے جیسا جس نے بتایا ویسا ہی کیا کبھی یہ سوچنا گوارہ نہیں کیا کہ ہوسکتا ہے بیٹے میں کوئی خامی ہو۔کئی جعل ساز جوضعیف لا اعتقاد بھولے بھالے لوگوں کو لوٹتے ہیں ان پر اپنا روپیہ برباد کیا۔

شیخو کا ماموں کسی کام سے شیخو کے گھر آیا تھا۔شیخو کی ماں نے اپنے بھائی کو اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اور التجا کی شیخو کا ایک اچھے ڈاکٹر سے معائنہ کراؤ۔ماموں کے ساتھ شیخو کو بھیج دیا۔دو دن بعد جب ماموں رپورٹ لے آیا تو اس میں درج تھا شیخو کے اسپرم(Sperm) کمزور ہیں۔باپ بننے کا چانس کم ہے۔کافی پیسہ خرچ کرنے پر علاج ہوسکتا ہے اور وہ اس قابل ہوسکتا ہے کہ باپ بن سکے۔اور یہ بھی 50 فیصد کوئی گیارنٹی نہیں۔اس رپورٹ کے بارے میں ماں اور بیٹے کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔شیخن بی بھی نہیں!

ایک شام مغرب کی نماز کے بعد شیخو کی ماں کو یہ احساس ہونے لگا کیوں نہ بہو سے پوچھیں۔

شیخن بی ایک بات پوچھنی ہے!

کہوں ماں! کیا بات ہے؟

''تمہاری اور شیخو کی شادی کو چار سال اوپر ہوتے ہیں اب تک بچہ نہیں ہوا''۔''اللہ میاں دے تو ہم لیں''شیخن بی کا یہ جواب سن کر شیخو کی ماں کہنے لگی۔

''تیرے میں کوئی کمی تو نہیں ہے شیخن؟

''نہیں ماں۔میرے میں کیا کمی ہوسکتی ہے میں پوری عورت ہوں اور اپنے مرد کی ہر جسمانی خواہش پوری کرسکتی ہوں''

شیخن بی کا جواب سن کر شیخو کی ماں کہنے لگی۔''بہو کیوں نا حکیم صاحب سے پوچھ لیں۔اگر کوئی کمی ہو تو حکیم صاحب کا علاج کرواتے ہیں''

''ماں میں تیار ہوں، کب چلنا ہے؟ لیکن ماں وہ آئیں تو ان کو ساتھ لیں؟

''نہیں پہلے ہم دونوں ہو آتے ہیں''۔

''ماں جو تم ٹھیک سمجھو''۔

حکیم صاحب نے شیخو کی ماں سے ساری باتیں سن لینے کے بعد شیخن بی سے کچھ سوالات کیے جو نسوانی امراض سے تعلق تھے،شیخن بی حکیم صاحب کا ہاں.....نا.....میں جواب دیتی رہی۔قریب ایک آدھ گھنٹہ باقاعدہ معائنہ کے بعد حکیم صاحب کہنے لگے۔''بڑی بی تمھاری بہو میں کوئی کمی ہے نہ خامی، وہ ماں بنے گی اپنے لڑکے کا علاج کراؤ''۔حکیم صاحب کی یہ بات سن کر شیخو کی ماں پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

افسوس! شیخو کی ماں یہ ارمان اپنے ساتھ قبر میں لے گئی۔شیخو نہ باپ بنا اور نہ شیخن بی ماں!!

شیخو کی ماں کا انتقال ہوئے چالیس دن بھی نہیں ہوئے تھے شیخن بی بغیر شیخو کو کچھ بتائے گھر سے غائب تھی۔شیخو شام تک راستہ دیکھا رہا۔جب کافی وقت ہو چکا اور رات بھی ہو چکی تو شیخو کو فکر ہونے لگی.....شیخن بی کہاں چلی گئی؟ کہاں جاسکتی ہے؟ اس نے محلے کے سارے گھروں میں جا جا کر شیخن بی کے بارے میں پوچھتا رہا،شیخن بی کے رشتے دار،ان کے یہاں بھی ہو آیا۔شیخن بی کا کہیں سراغ نہیں ملا۔کافی رات گزرنے کے بعد اچانک دروازے پر دستک ہوئی.....دروازہ کھولتے ہیں شیخن بی کو وہ اپنے سامنے کھڑا پایا۔

''کہاں تھی اتنی دیر،آدھی رات ہو چکی ہے! کہاں گئی تھی؟''

شیخن بی کچھ نہیں بولی، خاموش اپنے کمرے میں چلی

گئی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ شیخو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ شیخن بی کا اتنی رات تک گھر سے باہر رہنا اور پوچھنے پر کچھ نہ بتانا! شیخو صبر کی چادر اوڑھ کر سو گیا اور.....جب صبح فجر آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے؟ شیخن بی کے کمرے کا دروازہ کھلا پڑا ہے اور شیخن بی کمرے میں نہیں ہے۔

شیخو اکیلا رہ گیا تھا۔ ماں کا انتقال ہوا اور کچھ ہی دنوں میں شیخن بی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ پڑوسیوں کے کہنے پر وہ پھر سے دوسری شادی کرنے کے لیے تیار تو ہوا تھا مگر اسے پہلی بیوی سے چار سال بعد بھی اولاد نہ ہوئی اور وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ ایسی صورت حال ہے! کون ماں باپ اپنی بیٹی دے؟

شیخو کو تنہائی کی عادت ہوگئی تھی اکیلے رہتے رہتے تین ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ایک دن اچانک..... شیخن بی نمودار ہوئی!

شیخن بی پہلے سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی اور اس کے گداز جسم سے عجیب قسم کی خوشبو آرہی تھی۔ آنکھوں میں کاجل کی جگہ شوخیاں ناچتی اور مستیاں جھومتی نظر آرہی تھیں۔ شیخو حیران پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیخن بی کو تکتا رہا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کی زبان کو سانپ سونگھ لیا تھا۔

شیخن بی خود بول اٹھی، کیسے ہو؟ سنا ہے آپ شادی کر رہے ہو؟ یہ سن کر میں آئی ہوں! میں ابھی زندہ ہوں اور میری طلاق نہیں ہوئی! ہم دونوں اب بھی میاں بیوی ہیں۔ یہ آپ کیا کرنے جا رہے ہو؟ کیوں ایک لڑکی کی زندگی برباد کرتے ہو؟ میری زندگی آپ کے لیے ہے میں آپ کے لیے آپ کی خوشی کے لیے اتنا ضرور کرسکتی ہوں یک بچہ گود لے لیتی ہوں آپ کے گھر اولاد ہوگی۔

شیخو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا..... شیخن بی اتنے دن کہاں رہی اور کیا کرتی رہی.....اس کا بدلا بدلا انداز، اس کا پہلے سے زیادہ خوب صورت جسم، شیخو کچھ نہیں بولا!

دوسرے دن جب وہ گھر شام کو واپس آیا تو دیکھا شیخن بی کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے اور کمرے سے شیخن بی کی ہنسنے کی آواز آرہی تھی..... شیخن بی کی ہنسنے کی آواز کے ساتھ .....ایک مردانہ آواز بھی شامل تھی۔

ooo

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

شاعری

غزل

حامدی کاشمیری

خود اپنے جانے پہچانے نہیں تھے
وہ آئینوں سے بے گانے نہیں تھے

تباہی کا گلہ ہم کس سے کرتے
سب اپنے تھے بیگانے نہیں تھے

ہوتی تھیں آنکھیں ہی بے نور شاید
مکدّر آئینہ خانے نہیں تھے

ذرا سی بات پر یہ خون ریزی
قبیلے اتنے دیوانے نہیں تھے

سنائی دیتے ہیں پریوں کے نغمے
سر صحرا پری خانے نہیں تھے

فقط پل بھر لگی تھی آنکھ اپنی
یہ خارستان یہ ویرانے نہیں تھے

شاعری

غزلیں

علیم صبا نویدی

کچی نیندوں کا خواب جھوٹا ہے
شاعرانہ حساب جھوٹا ہے

زندگی سوچ سوچ کر برتیں
بادشاہی نصاب جھوٹا ہے

روبرو آئینے کے ننگا پن
آپ کا ہر حجاب جھوٹا ہے

فرش پر وہ کبھی نہ اُترے گا
عرش والا جناب جھوٹا ہے

چاندنی اوڑھ کر ہی سو جائیں
اب ملن رُت کا خواب جھوٹا ہے

سارے قصے قبول ہیں لیکن
آپ کا انتساب جھوٹا ہے

دل میں خاموش چاہتیں رکھنا
چند ادھوری سی قربتیں رکھنا

آسماں بھی جھکائے سر اپنا
ایسی بے باک جرائتیں رکھنا

چاند چھت پر اُترنے والا ہے
خوب صورت سی صورتیں رکھنا

پاس آنے کی کیا ضرورت ہے
دور رہ کر بھی نسبتیں رکھنا

نیک نامی مرا مقدر ہے
آپ کا فن ہے شہرتیں رکھنا

شاعری

غزلیں

جنوں اشرفی

بھروسہ کیا زمانے کا یہ کیسی چال چل جائے
نہ جانے کب کسی سر سے کسی کا سر بدل جائے
طبیعت موج دریا کی روانی میں مچل جائے
قدم پھر اہل ساحل کا عجب کیا ہے پھسل جائے
یقیں جانیں زبوں حالی مسافر کا مقدر ہے
اچانک راہ میں گر میل کا پتھر بدل جائے
سحر آتے چراغ شب پہ کچھ یوں آگئی رونق
کہ جیسے نزع میں بیمار کی حالت سنبھل جائے
تمہارے حسن وعدہ پر طبیعت یوں بہلتی ہے
کہ جیسے گود میں ماں کی کوئی بچہ بہل جائے
بغاوت پر اگر آئے ہمارے صبر کا سورج
زمیں پر آگ برسے خون کا چشمہ اُبل جائے
قیامت خیز منظر کا تماشہ دیکھتے ہم بھی
سوا نیزے پہ ایسا ہو کہ سورج بھی نکل جائے
زباں محفوظ رکھ الفاظ کی بے جا تمازت سے
جنوںؔ ڈر ہے کہیں تہذیب کا دامن نہ جل جائے

موج دریا نہ سمندر کی روانی لکھئے
دیدۂ تر کو مرے جھیل کا پانی لکھئے
صبح آغاز سفر جہد مسلسل سے بھرا
شام خوں ریز تصادم کی کہانی لکھئے
روز رہتا ہے فسادات کا منظر گھر میں
روز ہوتی ہے یہاں نقل مکانی لکھئے
رات سوئی رہی درد کی چادر اوڑھے
دن کے لہجے میں رہی کرب بیانی لکھئے
زرد موسم میں جو بے وقت یہ برسا پانی
خشک پودوں پہ اُمڈ آئی جوانی لکھئے
گر کہیں ذکر کبھی عدل جہانگیری ہو
قصۂ عشق تو پھر شاہجہانی لکھئے
ریگ زاروں میں اگے خار مغیلاں کو جنوںؔ
سبز موسم کے زمانے کی نشانی لکھئے

غزلیں

شاعری

پی پی سریواستورند

اندر اندر آگ سمیٹے، جانے کیا کیا لکھتا ہے
شامِ شفق کے پس منظر میں دل سناٹا لکھتا ہے

شہرِ خرد سے دل کے کھنڈر تک، پڑھتا ہے کچھ تحریریں
ڈھلتا سورج، رنگِ شفق سے حال جو دن کا لکھتا ہے

لمحوں میں غرقاب ہے صدیاں، بوسیدہ سے ماہ و سال
بھولا بسرا ماضی میرا، لوگ پرانا لکھتا ہے

باہر باہر خوشبو پھیلے، اندر اندر تازہ گھٹن
جیون بھر کی سچائی کو کون یہ جھوٹا لکھتا ہے

خوش فہمی کی چادر اوڑھے، اس کو اب سمجھائے کون
سورج کا رخ دیکھ کے سایہ، خود کو لمبا لکھتا ہے

گرم ہوا ، پتھریلا دریا، دھند مناظر، فن بیتاب
سفر سے پہلے گرد، آشنا، تھکن کا چرچا لکھتا ہے

رات منڈیروں پر بیٹھی ہے، سہمی سہمی، پر پھیلائے
رندؔ مگر اک زخمی جگنو، گھر میں اُجالا لکھتا ہے

معین الدین شاہین

قدم قدم پہ جلائیں گے دوستی کے چراغ
بلند لَو نہ کریں تاکہ دشمنی کے چراغ

بڑا سکون ملے گا تجھے، خدا کی قسم
جلا کے دیکھ کبھی امن و آشتی کے چراغ

غموں کی غار سے میں نے جسے نکالا تھا
بجھا دیے ہیں اسی نے میری خوشی کے چراغ

جلا کے خون جگر میرؔ اور غالبؔ نے
کیے ہیں بارہا روشن سخنوری کے چراغ

ہماری آنکھوں کا روغن کیا گیا شامل
جلے ہیں تب کہیں جا کر تیری گلی کے چراغ

سہل پسند طبیعت نے کر دیا غارت
جلا سکا نہ کوئی فکر و آگہی کے چراغ

مجھے تو شام کا منظر اُداس لگتا ہے
جلاؤں کیسے بھلا میں ہنسی خوشی کے چراغ

فسردگی سی فضاؤں میں پھیل جاتی ہے
بجھائے جاتے ہیں جس وقت زندگی کے چراغ

دھواں دھواں سا اٹھا ہے یہاں وہاں شاہینؔ
بجھائے ہوں گے امیری نے مفلسی کے چراغ

شاعری

غزلیں

آفاق فاخری

فصل گل ہی نہیں آرزو کیا کریں
اب کوئی خواہش رنگ و بو کیا کریں
جھوٹ پر جن کی باتوں کی بنیاد ہو
ایسے لوگوں سے ہم گفتگو کیا کریں
دیکھ کر چشم ساقی کو اپنی طرف
ہم تمنائے جام و سبو کیا کریں
جن کو رنگ چمن کی نہ پہچان ہو
ہم انھیں دے کے اپنا لہو کیا کریں
جب سلامت ہی بیراہن جاں نہ ہو
لیکے ہم اپنا دست رفو کیا کریں
نوک خار چمن پہ زباں رکھ کے ہم
فصل گل پر کوئی گفتگو کیا کریں
جس سے آفاق توہینِ کردار ہو
ایسی شہرت کی ہم آرزو کیا کریں

ہوائے فصل گل یوں آرہی ہے
اُداسی بام و در پر چھا رہی ہے
ہے ایسا آبلہ پائی کا عالم
کہ منزل دور ہوتی جارہی ہے
سکوں کے ساتھ جینے کی تمنا
ہر اک دل سے نکلتی جا رہی ہے
وہ جس کو بھولنا ہم چاہتے ہیں
اسی کی یاد لیکن آرہی ہے
زمانہ کی ہے؟ اک تاریخ جیسے
خود اپنے آپ کو دہرا رہی ہے
بلندی جس سے ملتی ہے جہاں میں
وہ بس اک دولت کردار ہی ہے
تھی جن کے پاؤں کی ٹھوکر میں دنیا
انھیں قدموں میں یہ دنیا رہی ہے
ہر اک مشکل کی آسانی میں آفاقؔ
مجھے ماں کی دعا یاد آرہی ہے

شاعری

غزلیں

شارق عدیل

طلب کے ساتھ میسر و صال بھی آئے
پھر اس کے بعد بدن پر زوال بھی آئے

سراب عمر میں کب سے بھٹک رہا ہوں میں
کوئی تو لمحہ سمندر مثال بھی آئے

ہم اپنے عہدِ گزشتہ کو پڑھ رہے ہیں ابھی
کمندیں زیرِ فلک لوگ ڈال بھی آئے

تیرے خیال سے ڈھونڈوں سفر کا رستہ بھی
ترا جو ذکر کہیں ہو تو حال بھی آئے

جو اب لکھنے میں ہم کو حجاب آنے لگا
کچھ امتحان میں ایسے سوال بھی آئے

کہ تو نے جن کو بنایا تھا پستیوں کا امیں
وہ آسمان کو تیرے کھنگال بھی آئے

سر بلندی پہ ہے کیا جوہر قابل میرا
ذرّہ ذرّہ ہوا سورج کے مماثل میرا

کتنی صدیوں سے ہے دریا کی طنابیں تھامے
پیاس ہونٹوں پہ سجائے ہوئے حامل میرا

کس لیے تو نے خدا مجھ کو کیا ہے نازل
ساری دنیا میں نہیں کوئی بھی حاصل میرا

اپنے بارے میں بھی سوچوں تو عجب لگتا ہے
جانے کس شئے کی طرف دل ہوا مائل میرا

جب تلک میں بھی رہا زعم و انا کی حد میں
کوئی دنیا میں نہ تھا مدِّ مقابل میرا

ابتدا مجھ سے ہوئی ہے مرے فن کی شارقؔ
دیکھنا کون بنے گا حدِ فاصل میرا

شاعری

غزلیں

رخشاں ہاشمی

درد جب بے حساب ہوتا ہے
دل کا رشتہ گلاب ہوتا ہے

وہ ہی ہوتے ہیں کامیاب یہاں
جن کی آنکھوں میں خواب ہوتا ہے

پیار گر زندگی میں آجائے
زندگی بھر عذاب ہوتا ہے

دیکھ کر ان کی دلکشی توبہ
دل میں بھی انقلاب ہوتا ہے

عشق کے ہر سوال پر ان کا
کتنا پیارا جواب ہوتا ہے

رخشاںؔ سارا قصور ہے اپنا
کب زمانہ خراب ہوتا ہے

جا نہیں سکتی جدھر جانے کو جی چاہتا ہے
ان دنوں یوں ہے کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

گھر میں رہتی ہوں تو باہر کی ہوا کھینچتی ہے
گھر سے جب نکلوں تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

میں نے کب باندھ کے رکھا ہے تمہیں پلّو سے
تم چلے جاؤ اگر جانے کو جی چاہتا ہے

عہد تو تھا کہ نہ توڑوں گی میں حدّ فاصل
آج وعدے سے مکر جانے کو جی چاہتا ہے

تیری آنکھوں میں تو رہتے ہوئے اک عمر ہوئی
اب ترے دل میں اُتر جانے کو جی چاہتا ہے

مدتوں بعد تیرا قرب ملا ہے مجھ کو
آج ہر حد سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

برق رفتار گزرتی ہوں وہیں سے رخشاںؔ
جس جگہ میرا ٹھہر جانے کو جی چاہتا ہے

سید یحییٰ نشیط

مطالعہ

غضنفر کی مثنوی: مثنوی کربِ جان

اردو شاعری کے اولین نقوش ہمیں مثنوی کی شکل میں دستیاب ہیں۔ چنانچہ نظامی بیدری کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو اردو کی پہلی مثنوی قرار دیا جاتا ہے۔اس سے قبل کی کوئی مستقل تصنیف تا حال دستیاب نہیں ہوئی۔اس صنف کو دکن میں جتنی مقبولیت حاصل ہوئی شمال میں نہیں ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی نگاری کا چلن دکن کے بالمقابل شمال میں بہت کم رہا۔ بالعموم مثنوی سے منظوم قصہ نویسی مراد لی جاتی رہی ہے۔اس میں جہاں خیالی قصے،کہانیاں بیان کی جاتی تھیں،وہاں تاریخی واقعات اور مذہبی قصص کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔مثلاً

۱) سحر البیان اور گلزار نسیم دونوں مثنویاں خیالی قصوں پر مشتمل ہیں۔

۲) نصرتی کی ''علی نامہ'' اور عبدل کی ''ابراہیم نامہ'' دونوں تاریخی واقعات پر مشتمل مثنویاں ہیں۔

۳) باقر آگاہ کی ''ہشت بہشت'' اور بلاقی کی ''معراج نامہ'' مذہبی نوعیت کی مثنویاں ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد اور حالی کے زمانے تک صنف مثنوی کے طرز اسلوب میں کوئی فرق نہیں آیا،البتہ انگریزوں کی ایماء پر جیسے ہی اردو شاعری میں جدید رجحان پروان چڑھتے گئے،مثنوی کا قالب تو جوں کا توں رہا مگر اس کے مضامین میں توسیع عمل میں آئی۔آزاد اور حالی کے یہاں اب مثنوی کے مضامین میں برکھارت،امید، خوشی،بہار،نصائح،مختصر سرگذشت،موسم،پھل وغیرہ شامل ہوئے۔ اس روایتی عروضی ڈھانچے میں مختلف موضوعات پر مثنویاں لکھی جانے لگیں۔شبلی و اقبال نے اسی روایتی اسلوب میں مثنویاں لکھیں۔یہ مثنوی کے فارم میں لکھی ہوئی منظومات کہلائیں۔

اقبال کے بعد اردو میں مثنوی نگاری زوال کا شکار ہوئی اور بڑی حد تک اس صف سے اغماض برتا گیا۔اس کی عروضی ہئیت کا استعمال تو ہوا مگر منظومات کے ذیل میں۔استادانِ فن نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔رفتہ رفتہ بیسویں صدی کے نصف اول تک مثنوی گویا پردۂ خفا میں چلی گئی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ صنف قصیدے کی طرح یہ بھی معدوم ہوجائے گی مگر عنبر بہرائچی اور ان کے چند معاصر نے ''لم یات نظیرک فی نظر'' اور ''سوانح گوتم'' منظوم لکھ کر مثنوی کے فن کی بازیافت کی کوشش ضرور کی۔اسی اثناء میں صفوت علی صفوت نے ''مثنوی وقت'' اور ''مثنوی رسول ﷺ'' لکھ کر مثنوی کے فن کو نہ صرف یہ کہ دوبارہ زندہ کیا بلکہ اس کے عروضی فارم میں تبدیلی بھی لائی۔یہ نیا تجربہ فی الحال تو انھیں پر ختم ہے۔

مثنوی کا روایتی عروضی ڈھانچہ سات بحروں پر مشتمل ہے۔یہ سات بحور اور ان کے اوزان درج ذیل ہیں۔

۱) بحر متقارب مثمن محذوف مقصور ۔۔فعولن فعولن فعولن فعولن/فعول

۲) بحر رمل مسدس محذوف مقصور ۔۔فاعلاتن فاعلاتن فاعلن / فاعلات

۳) بحر رمل مسدس مخبون محذوف / مقصور۔۔ فاعلاتن فعلاتن فعلن / فعلان

۴) بحر سریع مسدس مطوی محذوف /مقصور۔۔مفتعلن مفتعلن فاعلن /فاعلان

۵) بحر خفیف مسدس مخبون محذوف /مقصور ۔۔فاعلاتن

مفاعلن فعلن رفعلان

۶) بحر ہزج مسدس محذوف رمقصور ۔۔ مفاعیلن مفاعیلن فعولن رفعولان

۷) بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف رمقصور ۔۔ مفعول مفاعلن فعولن رمفاعیل

مثنوی کے مندرجۂ بالا روایتی اوزان کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین نے اور تین اوزان والی مثنویاں بھی تلاش کی ہیں ۔ یہ اوزان بحر متدارک مثمن مخبون (فعلن فعلن فعلن فعلن)، بحر متقارب مثمن اثرم مقبوض (فعل فعولن فعل فعولن)اور بحر متقارب مثمن اثلم (فعلن فعولن فعلن فعولن) ہیں ۔ صفوتؔ نے البتہ ' مثنوی وقت ' کے لیے بحر کامل مثمن سالم (متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن) استعمال کی ہے ۔ اس بحر میں مثنویِ وقت سے پہلے کسی نے بھی طبع آزمائی نہیں کی ۔ گویا یہ بحر مثنوی کے لیے جدت سے کم نہ تھی ۔ اسی بحر میں صفوتؔ نے بعد میں ''مثنویِ رسول ﷺ'' بھی لکھی تھی ۔ برصغیر میں ان دونوں مثنویوں کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی تھی ۔ ''مثنویِ وقت'' کا موضوع وقت کی کہانی ہے ۔ انفجار عظیم سے قبل وقت کیسا تھا ، اس کے بعد وقت کی کیا نوعیت ہے ۔ زمین پر اور خلاء میں سفر کیا جائے تو وقت پر قابو پایا جا سکتا ہے ۔

Twin Paradox کا سائنسی نظریہ اس کی تائید کرتا ہے ۔ اردو شاعری میں یہ موضوع بالکل نیا ہے اور مثنوی کی بحر اور موضوع بھی نئے ہیں ۔ صفوتؔ کی یہ کتاب (مثنویِ وقت) ۱۹۹۹ء میں اسلام آباد (پاکستان) سے شائع ہوئی تھی ۔

غضنفرؔ نے ''مثنویِ کربِ جاں'' میں اب ایک اور تجربہ کیا ہے ۔ وہ یہ کہ انھوں نے مثنوی کو اس کے روایتی اوزان میں دوبارہ زندگی دی ہے ۔ ان کی یہ مثنوی بحر متقارب مثمن محذوف رمقصور میں یعنی (فعولن فعولن فعولن فعولن) کے اوزان میں کہی گئی ہے ۔ یہی وزن میر حسن کی مثنوی سحر البیان میں بھی استعمال ہوا ہے ۔ حمد ، نعت ، منقبت اور مناجات جو مثنوی کے عناصر اربع مانے جاتے ہیں اور روایتی انداز میں ہمیشہ استعمال ہوتے رہے ہیں ، غضنفر نے ان کا اہتمام اپنی مثنوی میں کیا ہے ۔ یہ مثنوی کم و بیش سوا ہزار اشعار اور سترہ ابواب پر مشتمل ہے ۔ حمد و مناجات اور مدحت رسول ﷺ کے بعد اصل مثنوی شروع ہوتی ہے ۔ گویا یہ اس کا چوتھا باب ہے ۔ اس باب میں شاعر نے اپنی سوانح حیات بیان کی ہے ۔ میں اپنے مطالعہ کی بنیاد بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سوائے سراجؔ کی مثنوی ''بوستانِ خیال'' کے مجھے یہ طرز کہیں اور دکھائی نہیں دیا ۔ سراجؔ نے اپنے حالات اس مثنوی میں بیان کئے تھے ۔ سراجؔ کی مثنوی ''بوستانِ خیال'' ایک ہزار ایک سو ساٹھ اشعار کی ہے اور غضنفرؔ کی مثنوی کربِ جاں'' کے بھی ایک ہزار ایک سو ستائس یعنی لگ بھگ بوستان خیال کے اشعار کے برابر ہے ۔

غضنفر اپنی تخلیقات میں چاہے وہ ناول ہوں افسانے ہوں یا شاعری یا ڈرامے ہوں ، مثبت فکر اور حقیقت پسندانہ رویے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ وہ تخیلات کی موہوم دنیا کے حسین خواب نہیں دیکھتے ، کرب و بلا سے جھجھتی ہوئی زندگی کے حقائق بیان کرتے ہیں ۔

ایسے کسم پرسی کے حالات میں وہ انسانیت کی سرخروئی کو ترجیح دیتے ہیں ، اسی لیے ان کے یہاں حزن و نشاطیہ جذبات باہم مربوط نظر آتے ہیں ۔ وہ اندشہ ہائے دور دراز کی باتیں خوف زدہ انداز میں کرتے ہیں مگر ان کے اندرون قلب میں نہاں امید و آرزو کا نور خوف و ہراس کے اندھیاروں کو ختم کر دیتا ہے اور جہاں وہ یہ کہتے ہیں ۔

قرابت کا پنچھی اڑا شاخ سے
رفاقت کا پتا گرا شاخ سے

کدورت کے کوے لگے بولنے
عداوت کے گدھ منہ لگے کھولنے
نحوست کی چیلیں جھپٹنے لگیں
دل و ذہن و جاں سے چمٹنے لگیں
نظر بد نے یہ بھی کرشمہ کیا
جو اچھا تھا اس کو برا کر دیا

(مثنوی کرب جاں: غضنفر ص ۱۱۳)

وہاں وہ اپنی امید کا یوں بھی اظہار کرتے ہیں ۔

کلیمی عصا پھر سے آئے کوئی
تکبر کے سانپوں کو کھائے کوئی
کوئی کنٹھ نیلا کرے پھر یہاں
کوئی وش بدن کا ہرے پھر یہاں
کسی کے لیے کوئی بن باس لے
محل چھوڑ دے اور سنیاس لے
اٹھے نوجواں کوئی بے باک پھر
نئی دیونی کی کٹے ناک پھر

(ایضاً ص ۱۲۱)

درج بالا اشعار میں صنعتوں کے التزام کے لیے شاعر نے اسطوری فکر کو کس سلیقے استعمال کیا ہے! صنعت تلمیح دراصل شعر میں کسی دیومالائی یا تاریخی واقعے کی نشان دہی کرنے والے الفاظ کے استعمال کا نام نہیں، بلکہ ان الفاظ کے جلو میں جو واقعہ ہے اس کی معنویت شعر کے تناظر میں ابھر کر آئے اور شعر کے حسن کو دوبالا کر دے تب کہیں جا کر وہ لفظ صنعت کا حق ادا کرتا ہے۔ غضنفر نے جن تلمیحاتی الفاظ کا استعمال کیا ہے ان میں اسطوری فکر کے نظام کی وجہ سے شعر کے معنوی حسن میں اضافہ ہوا ہے ۔ 'کوئی کنٹھ نیلا' والے شعر میں لفظ 'ہرے' کی معنوی وسعت کا اندازہ لگانا ضروری ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ سمدر منتھن کے وقت سمندر سے برآمد ہوئے وش (زہر) کو شنکر نے پی لیا تھا جس کی وجہ سے تمام دیوتاؤں کی جان محفوظ رہی اور شنکر کا گلا زہر کے اثر سے نیلا ہو گیا۔ اس لیے شنکر کو وش ہرے (زہر سے نجات دینے والا) بھی کہتے ہیں۔ دوسری جانب 'ہرے' اس لفظ کا استعمال ہرے رنگ کے لیے بھی ہوا ہے ۔ شنکر کا گلا اگرچہ نیلا ہے مگر اس کا جسم گیہوں کے رنگ جیسا پیلا ہے ۔ فن مصوری میں ہرا رنگ تیار کرنے کے لیے پیلا اور نیلا رنگ یک جا کر دیتے ہیں ۔ شاعر نے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصوری کے اس لکتے کو ذہن میں رکھا ہوگا۔

اس مثنوی میں شاعر نے، ابتدا اپنے بچپن سے کی اور آج کے حالات پر اسے ختم کر دیا ۔ گویا یہ ساٹھ پینسٹھ سال کی ۴۴ روداد ہے، جس میں زمانے کے نشیب و فراز اور سیاسی اتھل پتھل، پراگندہ افکار، سماجی ابتری اقدار حیات کا زوال اخلاق کی پامالی اور انسانیت کی درماندگی کے علاوہ انسانی حیات کے سنگین مسائل کو پیش کیا گیا ہے ۔ اس اعتبار سے یہ مثنوی ایک قسم کی شہر آشوب ہے۔

مثنوی کی ابتداء غضنفر اپنے بچپن کی یادوں سے کرتے ہیں ۔ وہ اپنے اساتذہ کو یاد کرتے ہیں ۔ ان کی علمی بصیرت و بصارت کو نہایت والہانہ انداز میں بیان کرتے ہیں ۔ اپنے گاؤں کی تصویر کشی وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ سارے گاؤں کا منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے ۔ اپنے دوستوں کی رفاقت کو وہ بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں ۔ انھوں نے چتون کے تیر چلنے کی طرف بڑی خوبی سے اشارے کئے ہیں ۔

کوئی باس سانسوں میں بستی رہی
کوئی گندھ سانسوں کو کستی رہی
کبھی کوئی چلمن اٹھاتا رہا

کبھی کوئی چلمن گراتا رہا
کبھی اک کلی آنکھ میں کھل گئی
کبھی اک کلی خاک میں مل گئی

اپنی مثنوی کو انھوں نے افسانویت سے پاک رکھا ہے اور جو حقائق حیات ہیں انھیں برملا بیان کر دیا ہے۔اس لیے مثنوی میں تخیلاتی دنیا کے عجائبات کہیں نظر نہیں آتے ۔واقعات بیان کرتے ہوئے وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ ؎

نہیں دیو اس میں نہ جنات ہیں
نہیں داستاں جیسے حالات ہیں
نہیں کوئی اس میں طلسمی جہاں
نہیں سامری کا کوئی آستاں
نہیں کوئی اس میں اڑن تشتری
نہیں کوئی جادو کی انگشتری

درج بالا تمام عوامل تخیلاتی جہاں کے توہمات ہیں شاعر نے ان سے یکسر اپنا دامن بچایا ہے اور حقیقی دنیا کی صداقتوں کو واشگاف کرنے کی سعی فرمائی ہے ۔مثنوی جس میں بالعموم تخیلاتی قصوں کو اصل واقعات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے،غضنفر نے ان سے یکسر انحراف برتا ہے اور حقیقی دنیا کے احوال اپنے قارئین کے سامنے رکھے ہیں۔

غضنفر نے یہاں کی کچھ تنظیموں کی تنگ نظری پر کڑا طنز کیا ہے جو یہ کہتے ہین کہ مسلمان باہر سے آئے ہوئے ہیں ۔اس سرزمین پر انھیں رہنے کا کوئی اختیار نہیں حالانکہ یہ اعتراض خود ان پر بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ بھی تو خالص ہندوستانی نہیں ہیں،وہ بھی باہر ہی سے آئے ہوئے ہیں۔فرق اتنا ہے کہ وہ پہلے آئے ہم بعد کے واردین میں سے ہیں۔ہم نو واردین میں سے اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہے جو محبت و اخوت کے گیت سناتے ہوئے آئے تھے اور توحید کی دعوت دینا جن کا شعار تھا۔

شاعر کو دکھ ہے کہ یہ تنظیمیں نت نئے طریقوں سے اقلیتوں پر ظلم توڑتی رہتی ہیں اور پھر الزام بھی ان ہی پر دھرتی رہتی ہیں۔حالانکہ نو واردین کی آمد سے یہاں خوش حالی کو فروغ حاصل ہوا ،نفرتیں ختم ہوئیں،اخوت اور بھائی چارے کو عملی صورت میں معاشرے میں برتا گیا۔اونچ نیچ اور چھوت اچھوت کی تفریق ختم ہوئی اور اتحاد و اتفاق کے شجر سایہ دار کے نیچے سبھی نے اپنی دکھتی پیٹھ کو سیدھا کیا اور ایک گھاٹ کا پانی پینے لگے۔شاعر نے نہایت سادہ مگر موثر انداز میں ان واقعات کی تصویر کشی کی ہے ؎

بدلنے لگا ان کے دم سے سماں
نیا روپ لینے لگا اب جہاں
لگا کوئی خیمہ مساوات کا
ہوا سلسلہ اک ملاقات کا
سمٹنے لگا نسل کا امتیاز
رہا کوئی بندہ نہ بندہ نواز
بکھرنے لگا رنگ کا بھی غبار
اترنے لگا برتری کا خمار
(ایضاً ص۷۶۔۷۷)

لیکن فتنہ پردازوں کو یہ امن شانتی گوارہ نہ تھی ،اس لیے وہ فتنے پیدا کر کے یہاں کی پر امن زندگی کو جھک جھور کرنے لگے۔شاعر نے اس کی تصویر کشی بڑے موثر انداز میں کی ہے ؎

مگر اس کا ایسا اثر بھی ہوا
اٹھا ناگ برسوں کا سویا ہوا
اچانک وہ پھن کو اٹھانے لگا
غضب ناک چہرہ دکھانے لگا
بدن دھیرے دھیرے اچھلنے لگا

نگاہوں سے شعلہ نکلنے لگا

بالآخر چنتن منن کے بعد ایک یوجنا بنائی گئی کہ ہر ممکن طرح سے سماج میں دہشت پھیلائی جائے اور یوجنا بدھ طریقے سے بے چینی پیدا کر کے سماج کی شانتی کو نشٹ کیا جائے۔اس کے لیے حب الوطنی کا جھوٹا راگ الاپا گیا،قومیت کے نام پر مذہب پرستی کو خوب خوب ہوا دی گئی۔اس طرح سماج میں پھوٹ ڈالی گئی اور جس طرح انگریزوں کا چھل کپٹ کے ذریعہ پھوٹ ڈالو اور راج کرو،وتیرہ رہا اسی طرز کو اپنانے کی کوششیں ہوتی رہیں اور اتحاد و باہمی اخوت کے شیرازے کو بکھرانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔شاعر نے ان تمام فتنہ پردازیوں کو شاعرانہ انداز میں درد بھرے دل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

غضنفر کی اس مثنوی کے صرف تین کردار ہیں باہری ،فتنہ گر اور امن پسند۔اس میں ایک کردار ایسا بھی ہے جو بالکل خاموش ہے مگر محبت کا رسیا اور اخوت کا جویا ہے۔وہ بس حسین خواب دیکھتا ہے اور امن واماں کا تمنائی ہے۔وہ خاموش کردار خود شاعر کی ذات ہے جس نے اخوت اور بھائی چارگی کو بڑھاوا دینے کے لیے یہ مثنوی قلم بند کی ہے۔اس کی خواہش ہے کہ ؎

کہیں سے ہوا کاش ایسی بھی آئے
جو ہمراہ الفت کی سوغات لائے
محبت سے آنکھوں میں مستی سی چھائے
محبت سے ہر سانس سرگم بجائے
محبت سے اک اک نگر جگمگائے
محبت سے اک اک بشر کھل کھلائے
زمیں سے فلک کی طرف لے کے جائے
حسیں خواب کی وادیوں میں گھمائے
دل و جاں کے زخموں پہ مرہم لگائے
بدن کی طنابوں کی اینٹھن مٹائے
پپوٹوں کے اوپر سے پتھر ہٹائے
نظر کو شکنجوں سے مکتی دلائے

ان نیک تمناؤں کے ساتھ مثنوی ختم ہوتی ہے۔نفرت کی دہکتی،سلگا دینے والی آگ کے درمیاں محبت کی شبنم کی خواہش رکھنے والا شاعر یقیناً پرستارِ محبت ہے اس کی شگفتہ تحریر ہی سے پتہ چلتا ہے کہ جو بات اس کے دل میں نہاں ہے وہ لفظ بن کر قرطاس پر اتر آتی ہے۔مثنوی ''کربِ جاں'' ان شاء اللہ تعالیٰ اردو صنف مثنوی کو ایک نئی سمت عطا کرے گی۔

OOO

مضامین ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

(دو جلدوں میں)

مرتب: سید رفیع الدین قادری

تزئین کار: پروفیسر مجید بیدار

زیر نگرانی

محمد رحیم الدین انصاری

(سابق صدر نشین اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش)

زیر اہتمام: اردو اکیڈی آندھرا پردیش

قیمت: -/400 روپے فی جلد

رپورتاژ

دوروزہ قومی سمینار عثمانیہ یونیورسٹی.... تاریخ تہذیب اور امکانات

محکمہ اقلیتی بہبود حکومت ،تلنگانہ اور اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام عثمانیہ صدی تقاریب کے سلسلے میں دو روزہ قومی سمینار''عثمانیہ یونیورسٹی تاریخ، تہذیب اور امکانات'' کے عنوان سے 22اور23 مئی 2017ء کو ہوٹل پلازا نزد چیف منسٹر کیمپ آفس بیگم پیٹ حیدرآباد میں منعقد ہوا۔

افتتاحی تقریب 22/مئی 2017ء کو پونے بارہ بجے شروع ہوئی۔صدارت نائب وزیراعلیٰ، جناب محمد محمود علی نے فرمائی اور جناب اے کے خاں صاحب،مشیر اقلیتی بہبود اور جناب سید عمر جلیل صاحب،سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود اور پروفیسر سلیمان صدیقی، سابق وائس چانسلر،عثمانیہ یونیورسٹی،حیدرآباد مہمانانِ خصوصی تھے۔ حضور نظام کے فرزند نواب فضل جاہ کا نام بھی مہمانوں کی فہرست میں شامل ضرور تھا مگر وہ نہیں آئے۔

پروفیسر ایس۔اے۔شکور، ڈائریکٹر /سکریٹری نے اس سمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس میں مقالے پیش کرنے کے لیے عثمانیہ کے سینئر اساتذہ کو زحمت دی گئی ہے۔ڈائریکٹر صاحب نے فرمایا کہ جملہ گیارہ مقالے پڑھے جائیں گے اور ان مقالوں کو اکاڈیمی کی طرف سے شائع کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی۔تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی خدمات پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر جاوید کمال اور ان کے ساتھیوں نے محمد علی نیر کی لکھی نظم کو بطور ترانہ پیش کی جس کے ٹیپ کے دو مصرعے اپنی طرف سے لگائے۔''مبارک جامعہ عثمانیہ مبارک ہو''۔

جناب سید عمر جلیل صاحب،سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود، ریاست تلنگانہ نے فرمایا کہ ہر عثمانین کو صدی تقاریب منانے کا شوق ہوتا ہے انھوں نے کہا کہ وہ بھی عثمانین ہیں۔ایک مقامی زبان اردو کو عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم بنا کر کامیاب تجربہ کیا گیا تھا۔عثمانیہ کا یہ اہم کردار چھپ گیا تھا اسے اُجاگر کرنے کے لیے ہم نے متوازی تقاریب کا انعقاد کیا۔ پروفیسر سلیمان صدیقی ،سابق وائس چانسلر،عثمانیہ یونیورسٹی نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے تعلق سے Power Point Presentation انگریزی میں دیا۔ حالاں کہ وہ اردو میں بھی بول لیا کرتے ہیں۔سلیمان صدیقی نے عثمانیہ یونیورسٹی کے باب الداخلہ پر کندہ مشہور مقولے کا ذکر کیا''انا مدینتہ العلم وعلی بابہا'' جو حدیث کی طرح مشہور ہے۔انھوں نے کہا کہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم بھلے ہی اردو تھا مگر انگریزی زبان لازمی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سترہ سو ایکڑ زمین کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی جو سمٹ کر اب تیرہ سو ایکڑ رہ گیا ہے۔ یونیورسٹی کی تعمیر ہندو مسلم کلچر کی نمائندہ ہے۔اس پر ایک گنبد بھی ڈیزائن کیا گیا تھا بعد میں اس پر عمل نہیں ہوا۔ یہ عمارت گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ بولی نکولاس نے چھبیس دسمبر 1943ء میں لکھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی ہندو مسلم تہذیب کا خواب ہے جو پتھر میں سمو دیا گیا۔

6/ستمبر 1917ء کو دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔مولوی عبدالحق بنیادگزار ہیں۔1818ء میں دائرۃ المعارف قایم ہوا۔

جناب اے۔کے۔خان صاحب نے وقت کی پابندی پر زور دیا۔سوڈیڑھ سو لوگ اس سمینار ہال میں موجود ہیں مگر ہزاروں لوگ سمینار سے باہر اس کی تفصیلات جاننے کے مشتاق ہیں۔ان تک اس سمینار کی روداد پہنچنی چاہئے۔انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ فرمایا کہ دارالترجمہ ختم ہو چکا ہے مگر اب یہ سوچنا ہے کہ دائرۃ المعارف کو کیسے بچایا جائے۔اے کے خان صاحب نے فرمایا کہ

عثمانیہ یونیورسٹی کی تعمیر میں ہندو مسلم، بدھسٹ اور یورپین طرز تعمیر شامل ہے۔

پروفیسر انور معظم نے حکومت تلنگانہ کے اس اقدام کی تعریف کی کہ دوسو سے زیادہ اقامتی اسکول قائم کیے گئے۔ سابق چیف منسٹر چنا ریڈی نے کہا تھا کہ 1956ء میں نظام اسٹیٹ کی لسانی بنیادوں پر جو تقسیم ہوئی وہ غلط تھی۔ ریاست حیدآباد کو ایک صوبے کی طرح محفوظ رکھنا چاہیے تھا۔ انور معظم نے کہا کہ سید جمال الدین افغانی 1889ء میں مصر سے حیدرآباد آئے دو تین برس یہاں رہ کر فارسی میں مضامین لکھے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کی اپنی زبان میں تعلیم نہ دی جائے ان کی تحریک پر یہاں اردو ذریعہ تعلیم کی بنیاد پڑی۔ انھوں نے اس خیال کو رد کیا کہ فرانس سے آئے ہوئے مسٹر بلنٹ Blunt نے مقامی زبان میں تعلیم پر توجہ دلائی تھی۔

جناب محمد محمود علی، نائب وزیر اعلیٰ، ریاست تلنگانہ نے کہا کہ 1928ء میں گاندھی جی نے حیدرآباد اسٹیٹ کو گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ کہا تھا۔ تلنگانہ بننے کے بعد کوئی فساد نہیں ہوا۔ وویک وردھنی کالج کو سو فی صدی تعاون کرنے والے مسلمان ہی تھے۔ اب مسلم غریب بچیوں کی شادی کے لیے حکومت کی طرف سے -/75,116 کی امداد کی جاتی ہے۔ بارہ فی صد تحفظات کا بل پاس کر کے چیف منسٹر نے مسلمانوں سے ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مسلمان بچوں کو اعلی تعلیم کے لیے بیس لاکھ روپے کی مدد کی جاتی ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی وجہ سے حضور نظام کا نام ہزاروں سال تک لیا جائے گا۔ جناب اسلم فرشوری نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ چوں کہ بہت تاخیر ہوچکی تھی اس لیے افتتاحی اجلاس کے فوری بعد زبردست لنچ کا انتظام کیا گیا تھا۔ سمینار کا پہلا اجلاس ڈاکٹر رحیم الدین کمال کی صدارت میں ہونا تھا مگر ان کے نہ آنے سے پروفیسر سلیمان صدیقی کی صدارت میں ہوا اور جناب محبوب خان اصغر نے بڑے سلیقے سے نظامت فرمائی۔ انھوں نے مقالہ نگار پروفیسر بیگ احساس کو مختصر مگر جامع تعارف کے ساتھ مقالہ سنانے کی دعوت دی۔

پروفیسر بیگ احساس، سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ و یونیورسٹی آف حیدرآباد نے جامعہ عثمانیہ کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ نواب شمس الامراء نے 43-1842ء میں مدرسہ فخریہ کی بنیاد ڈالی تھی جہاں مختلف موضوعات کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوتا تھا۔ اس مدرسہ کو جامعہ عثمانیہ کا نقش اول قرار دیا جا سکتا ہے۔ آصف سادس میر محبوب علی خاں نے اردو یونیورسٹی کے لیے محمڈن یونیوسٹی کا نام تجویز کیا تھا۔ میر عثمان علی خاں بہادر کے دور میں تحتانیہ، وسطانیہ و فوقانیہ مدارس کا جال پھیلا دیا تھا جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا، چنانچہ اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ عدالت میں اردو مروج تھی۔ 24/اپریل 1917ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری عمل میں آئی اور باضابطہ افتتاح 28/ اگست 1919ء کو ہوا۔

اس مقالے کے بعد کچھ لوگوں نے سوالات اٹھائے جو پچھلے سیشن سے تعلق رکھتے تھے چناں چہ صدر اجلاس سلیمان صدیقی نے ان سوالات کو روک دیا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال مدیر، شگوفہ نے حیدرآباد کی لسانی صورت حال پر مقالہ پیش کیا اور کہا 1724ء میں آصف جاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ دیہی ریکارڈ علاقائی زبانوں میں تیار کیا جاتا تھا۔ عادل شاہیوں نے فارسی کو دفتری زبان سے ہٹا کر مرہٹی کو بنا دیا۔ انھوں نے مزید کہا ہندوی زبان کو اردو سمجھ لینا بالکل غلط ہے۔ 1882ء تک بھی اردو ذریعہ تعلیم کا کوئی سرکاری مدرسہ نہیں

تھا۔البتہ خانگی مدارس ضرور تھے۔میر عثمان علی خاں بہادر کے ساتھ سر اکبر حیدری کا نام لینا بہت ضروری ہے۔1901ء سے 1912ء تک بھی لوگ فارسی کے پیچھے پڑے رہے اردو پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ایک علاقے میں دوسرے علاقے کی زبان سمجھنے والے نہیں تھے مگر اردو ہر علاقے میں سمجھی بولی جاتی تھی اسی لیے اردو کو سرکاری زبان بنایا گیا۔اردو ایک سیکولر زبان تھی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر اشرف رفیع نے کی اور عثمانیہ سے وابستہ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے جامعہ عثمانیہ کے قیام پر اور ڈاکٹر فاطمہ پروین نے جامعہ عثمانیہ کی تہذیبی روایات پر روشنی ڈالی۔حیدرآباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر حبیب نثار نے جامعاتی سطح پر اردو ذریعہ تعلیم اور انگریزی زبان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔کچھ لوگوں نے سوال برائے سوال کیا۔ڈاکٹر جاوید کمال نے نظامت کی۔

دوسرے دن 23/مئی 2017ء کا پہلا اجلاس ساڑھے دس کے بجائے ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوا۔مصطفےٰ کمال نے صدارت کی۔اشرف رفیع صاحبہ نے دار الترجمہ کے قیام کے مراحل پر مقالہ پیش کیا تو ڈاکٹر فضل اللہ مکرم نے حضوم نظام میر عثمان علی خان بہادر کے تصور تعلیم کو پیش کیا اور ڈاکٹر مجید بیدار نے وضع اصطلاحات پر مقالہ پیش کیا۔TERM کی تشریح کرتے ہوئے مجید بیدار نے کہا کہ کسی لفظ کو کچھ اور معنی پہنائے جائیں یا کوئی نیا لفظ دیا جائے تو اسے TERM یا اصطلاح کہا جاتا ہے۔دار الترجمہ میں ناظر ادب جوش ملیح آبادی اور ناظر مذہب عبداللہ عمادی مقرر ہوئے تھے۔129 مترجمین کے ذریعے 386 کتابیں ترجمہ کی گئیں۔اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کے نام سے جمیل جالبی نے دو جلدیں مرتب کی ہیں۔انھوں نے مطلق العنان بادشاہ کی اعلیٰ ظرفی کی داد دی کہ جس نے ہر معاملہ کمیٹیوں کے ذریعے طے کرنے کی آزادی دی۔

انھوں نے کہا ابتداء عربی اصطلاحات جیسے مقیاس الحرارت وضع کی گئیں پھر فارسی اصطلاحات سے جیسے قطب نما، باد پیما وغیرہ استعمال کی گئیں پھر انگریزی الفاظ کو ذرا سے تصرف سے اپنا لیا گیا بوٹل سے بوتل، ہاسپٹل سے ہاسپتال وغیرہ نئی اصطلاحات پر روشنی ڈالتے ہوئے مجید بیدار نے آپٹیکل کے لیے وحید الدین سلیم کے اختراعی لفظ عینک کا اظہار کیا جو عین اور ناک کے امتزاج سے وجود ہوآیا۔اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر حمیرا تسنیم نے انجام دیئے۔

اس اجلاس کے بعد بہترین لنچ کا اہتمام کیا گیا۔اچانک لنچ سے پہلے پہلے کچھ لوگ تشریف لائے اور لنچ کے فوری بعد چلے گئے۔

ظہرانے کے بعد دو روزہ سمینار کا آخری اجلاس پروفیسر احمد اللہ کی صدارت میں ہوا مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے وابستہ اور میڈیا کے تجربہ کار فرد میرا ایوب علی خان کا مقالہ جامعہ عثمانیہ کی موجودہ صورتِ حال مسائل اور تجاویز پر مشتمل تھا۔محمد نذیر احمد صاحب تعلیم کے بدلتے منظر نامے پر اور ہفت وار گواہ کے مدیر ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز ناموران جامعہ عثمانیہ پر اپنے اپنے مقالے پڑھنے والے تھے۔اچھے موضوعات پر مقالے سننے سے سامعین محروم رہے۔دونوں مقالہ نگار تشریف نہیں لائے۔

میر ایوب علی خاں نے افسوس کا اظہار کیا کہ لوگ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی خوبیوں کے بجائے اس کی کوتاہوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں ان کو اندازہ نہیں ہے کہ حکومت وقت سے سکیموں کی منظوری کے لیے کس قدر مشکلیں جھیلنی پڑتی ہیں۔انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے عملے Staff کے تعلق سے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے بتایا کہ بارہ سو پچاس کے بجائے صرف پانچ سو پچاس پروفیسر وہاں کام کر رہے ہیں ارد و کا تو صرف ایک ہی

پروفیسر ہے وہ بھی تلنگانہ اردو اکاڈمی کے ڈائریکٹر سکریٹری ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی ہندوستان کی ساتویں بڑی یونیورسٹی شمار ہوتی ہے۔ تلنگانہ میں ستّر اسّی فی صد دلت رہتے ہیں ان کا داخلہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوتا ہے تو یہ ہاسٹل سے استفادے کے لیے داخل ہوتے ہیں انھیں کوئی نکال نہیں سکتا۔ مسلم طلبہ کی تعداد بمشکل پانچ فی صد ہے۔ دلت طلبہ کو فی کس اٹھارہ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ ملتا ہے جب کہ مسلم بچے کو کسی قسم کا وظیفہ ہی نہیں ملتا564 طلبہ کا پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن ہوا ہے۔

پروفیسر احمد اللہ نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ .Ph.D میں اتنے زیادہ طلبہ کا ارجسٹریشن ہو رہا ہے تو ان کے موضوعات کہاں سے آرہے ہیں ان کے گائیڈ کہاں سے آرہے ہیں۔ پھر انھوں نے ایک انگریز مفکر کے حوالے سے فرمایا کہ تعلیم دراصل منصوبہ بند ہوتی ہے(Education is a Plan) ٹیچر اپنے طلبہ میں اپنی صلاحیتیں منتقل کرتا ہے۔ نظامت ڈاکٹر گل رعنا نے کی۔

اس اجلاس کے بعد اختتامی اجلاس ہوا جس کی صدارت اے کے خان صاحب نے کی مہمانان خصوصی جناب سید عمر جلیل، پروفیسر بیگ احساس، ڈاکٹر معید جاوید اور نجف علی خاں، نبیرہ میر عثمان علی خاں تھے۔ پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے پروفیسر بیگ احساس کو سمینار کی کاروائی کو سمیٹنے Sum up کی دعوت دی۔ پروفیسر بیگ احساس نے بے حد سلیقے سے دو روزہ اجلاس کا بڑی باریک بینی سے جائزہ پیش کیا۔ اور اٹھائے ہوئے مختلف سوالات کے جوابات بھی اپنے جائزے میں دیئے۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں جب صد سالہ تقاریب منائی جارہی ہیں تو پھر محکمہ اقلیتی بہبود اور تلنگانہ اردو اکاڈمی کی جانب سے اس دو روزہ سمینار کا کیا جواز ہے، پروفیسر بیگ احساس نے فرمایا کہ عثمانیہ کی تقاریب میں اردو کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اسی لیے عثمانیہ یونیورسٹی کے ماضی، حال اور مستقبل کے جائزے کے لیے ہم نے کوشش کی اور سمینار کا عنوان بڑے غور و خوص کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کی تاریخ تہذیب اور امکانات طے کیا گیا۔ چوں کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر امریکہ گئے ہوئے ہیں اسی لیے ہم نے سابق وائس چانسلر سلیمان صدیقی کو یہاں مدعو کیا۔ جامعہ کی طرز تعمیر پر روشنی ڈالتے ہوئے بیگ صاحب نے فرمایا کہ اس کے ستون ایلورہ کی طرح ہیں۔ یونانی طرز تعمیر بھی ہے اور اس کی راہداریاں اتنی کشادہ ہیں کہ بس چل سکتی ہے۔ حضور نظام نے اپنے لیے کوئی شاندار محل نہیں بنایا مگر شاندار یونیورسٹی قائم کر دی۔ اس ملک کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تھے اور وائس چانسلر علی یاور جنگ تھے اس کے باوجود اس کا ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی کر دیا گیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے کئی قابل شخصیتیں نکلیں خود سید عمر جلیل یہاں موجود ہیں جن سے نئی نسل کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ جو مقالے پڑھے گئے وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ماضی سے تعلق رکھتے تھے دیگر مقالے حال اور مستقبل سے متعلق تھے۔ تہذیبی شناخت ختم ہو رہی ہے۔ اب دلت طلبہ صرف سکالرشپ، بس پاس اور ہاسٹل کی سہولت سے استفادے کے لیے داخلہ لے رہے ہیں۔ یونیورسٹی کا سنگ بنیاد مٹی میں دبا ہوا ہے جسے نمایاں مقام پر لگایا نہیں جا سکتا۔ لینڈ سکیپ گارڈن یوگا کا میدان بن گیا ہے۔ وژن آف عثمانیہ صرف مہمانوں کے لیے کھولا جاتا ہے۔ سید عمر جلیل صاحب نے فرمایا کہ ہم چوں کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی صدی تقاریب کا حصہ بن نہیں پائے اس لیے وابستگان نے یہ سمینار منعقد کیا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ عثمانین شخصیات پر اہم معلومات بہم پہنچائیں۔

ڈاکٹر معید جاوید صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ نے چند

کلمات کے بعد جامعہ کو منظوم اور ترنم میں خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے دو تین شعر ہم بلا تبصرہ من وعن پیش کرتے ہیں۔

جان و دل سے ترا احترام جامعہ
تیری عظمت کو لاکھوں سلام جامعہ
تیرا ثانی نہیں ہے جہاں میں کوئی
سارے عالم میں اونچا مقام جامعہ
تیری رفعت کا ممکن نہیں کچھ بیاں
سب تیرے مقتدی ٔ تو امام جامعہ

پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے کہا کہ تمام مقالوں کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا انھوں نے کہا کہ یہ مقالے دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔

نواب نجف علی خاں نے صدی تقاریب میں شرکت کو اپنے لیے ایک اعزاز قرار دیا۔انھوں نے کہا کہ اس جامعہ کا دنیا بھر میں اعلیٰ مقام ومرتبہ ہے۔

محترم اے کے خاں صاحب نے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا ڈیزائن اجنتا وایلورہ کا ہے۔اب دائرۃ المعارف کو بچانا ضروری ہے۔انگریزی ذریعہ تعلیم اب لازمی ہے مگر اردو زبان بھی پڑھائی جائے۔آپ جب تک مضبوط نہیں ہوتے کوئی مطالبہ منوا نہیں سکتے۔میں مطمئن ہوں کہ یہ دوروزہ سمینار کامیاب رہا۔ان شاءاللہ ایسے پروگرام سال بھر چلتے رہوں گے۔اس طرح یہ شاندار دوروزہ تقاریب اختتام کو پہنچیں۔

اختتام پر جاوید کمال اور ان کے ساتھیوں نے سکندر علی وجد کی نظم پیش کی۔قومی ترانہ بھی پیش کیا گیا۔

OOO

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین
کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب
سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:
زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶
ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

نواب میر عثمان علی خاں، آصف جاہ سابع کی سلور جوبلی کے موقع پر جاری کردہ ٹپہ ورسید ٹکٹ جس پر چاروں زبانوں میں ایک آنہ لکھا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی عمارت کا نقشہ ہے جس میں گنبد موجود ہے۔ آصف جاہ سابع نے اپنی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گنبد کے بغیر عمارت تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔

Regd No. H-HD 970-2015-2017 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.79, Issue-06 June, 2017 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے موقر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ **سیاست** نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطیٰ، یو کے، یو ایس اے اور کینڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

...اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، **سیاست** کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائیٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائیٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کرکے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کررہا ہے۔

روزنامہ **سیاست** حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : **24744180, 24603666, 24744109, 24744114**
Fax : Editorial : **040-24603188**, Advertisement : **24610379**
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام **سیاست**

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (A.P.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469